
نشانات
شبنم قیوم

افسانے

نشانات

شبنم قیوم

اشاعت	:	ستمبر ۲۰۰۷
تعداد	:	پانچ سو
صفحات	:	152
ٹائپ سیٹنگ	:	ندیم یوسف
قیمت	:	۱ سو روپے

اس کتاب کی طباعت کیلئے جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سے مالی مدد حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکیڈیمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈیمی پر کوئی ذمہ داری عاید ہوگی۔

ناشر

وقار پبلی کیشنز

219 عیدگاہ لین لال نگر چھانہ پورہ، سرینگر کشمیر

انتساب

اپنے اَن پڑھ
والدین کے نام
جو صبح و شام مجھے قلم کاغذ لئے صرف لکھتے پڑھتے
دیکھ کر آپس میں سوچا کرتے تھے۔ ہمارا یہ بڑا
بیٹا کیا لکھتا اور کتنا لکھتا رہتا ہے۔ جب اُنہیں
کچھ کچھ سمجھ میں آیا تب انہیں فخر ضرور ہوا۔

شبنم قیوم

فہرست مضامین

خورشید عالم

شبنم قیوم......اور اُس کا فن

بقول قمر اعظم ہاشمی اگر آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھ کر آپ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہ سمجھیں کہ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا ہے تو یہ اُس شاعِ مجسم کا قصور نہیں۔ قصور سراسر آپ کا ہے۔ حقیقتیں زیادہ دنوں جھٹلائی نہیں جاسکتیں۔ ممکن ہے کچھ دنوں اُنہیں دبا دیا جاسکے لیکن پھر ان کا پوری شدت کے ساتھ اُبھرنا بھی متیقن ہے۔ اگر غالب پر اس کے عہد نے کیچڑ اچھالی تو غالب پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ غالب ابھرے اور پوری شدت سے اُبھرے۔ اس سے پہلے نظیر اکبر آبادی کو بورژوا طبقے نے میدان شاعری سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تو اس سے نظیر زیادہ عرصے تک دبے نہ رہ سکے۔ زمانہ آیا اور وہ ہاتھوں ہاتھ اُٹھائے گئے۔

ہمارے ہر نئے ادیب کے ساتھ کم از کم یہی سلوک کیا جارہا ہے۔ لیکن وہ ابھر رہے ہیں اور اپنے بل بوتے پر ابھر رہے ہیں۔ سرزمین کشمیر کے ایک قلمکار ادیب دانشور کے بارے میں بھی ہمیں ایسے خیالات کا اظہار کرنا پڑا ہے۔

شبنم قیوم نے فروری ۱۹۳۸ء میں کشمیر کی حسین وادی میں ڈل گیٹ کی اُس سرزمین پر جنم لیا ہے جس کے بارے میں عام لوگوں کا خیال ہے، یہاں کی آب و ہوا ادب اور شاعری کو خوب راس آتی ہے۔ کیونکہ کشمیر میں دوسرے علاقوں کی نسبت ڈل گیٹ نے قلمکاروں کی کثیر تعداد اُردو اور کشمیری ادب کو دی ہے۔ اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں شبنم

قیوم کم تعلیمیافتہ ہے، مگر اوروں کی نسبت اس نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ ۱۹۵۷ء سے وہ مسلسل لکھ رہا ہے۔ اس وقت کم وبیش درجن بھر کتابوں کا وہ لیکھک رہا ہے۔ مصنف کا لفظ میں جان بوجھ کر یہاں استعمال نہیں کرر ہا ہوں۔

شبنم قیوم ایسا فنکار نہیں جس کو یہ فن ورثے میں ملا ہو۔ لیکن اس کے خاندان میں ادیب شاعری، صحافی اور ڈرامہ نگار سب ہی موجود ہیں۔ اپنے پرائے لکھنے والوں کو اس کی تعلیم اور تحریر دیکھ کر یقیناً حیرت ہوتی ہے اور یہی حیرت ان کو اس کا رقیب بھی بناتی ہے...... شبنم قیوم کی اپنی علیحدہ دنیا ہے۔ جہاں وہ بالکل تنہا ہمارے لئے کہانیاں لکھتے لکھتے خود ادبی رقیبوں کے لئے کہانی بن جاتا ہے۔ وہ فنکار پیدا ہوا ہے۔ اس کا اعتراف ملک کے کئی نقادوں نے کیا ہے۔ سید اختشام حسین نے بھی اس کے کمال فن کا اعتراف اپنے ایک خط میں کیا ہے۔...... شبنم قیوم کی زندگی بہت سے نشیب وفراز سے گزری ہے۔ حیات کی پیچ در پیچ اور دشوار گذار راہوں کو اسے طے کرنا پڑا۔ کبھی اس وسیع صحرائے حیات میں مدتوں تلاش آب دوانہ میں بھٹکتے رہے اور کبھی جو منزل پر پہنچے تو ان کی منزل اور آگے بڑھ گئی۔ زندگی کی انتھک کٹھن اور جاں گسل ساعتوں سے گزر کر کتنے ہی سخت لمحات کے کڑے کاٹ دیئے۔ آفتاب وصدمات کی بھیانک موجوں کا مقابلہ کر کے تشکیک کی ان گنت تاریک گھڑیوں میں گر کر آزمائشات کے نہ جانے کتنے مرحلوں کو طے کرلیا......،

شبنم قیوم ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ طبیعت کا سادہ اور معصوم ہے۔ خلوص نرمی اور اپناپن اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ خودداری اور احساس دونوں ہی ہر لمحے اس کے ساتھ ہیں۔ ان کی تخلیقات میں درد اور تڑپ ہے۔ زندگی کی گہرائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ فطرت انسانی سے وہ بخوبی واقف ہے۔ اس لئے کہ اُس نے زندگی کی تمام زہرناکیوں، تشنگیوں اور تلخیوں کو بڑے صبر اور سکون سے اپنے اندر سمولیا ہے۔ اس نے احساس کے جسم پر نہ جانے کتنے زخم کھائے۔ لیکن انسانیت کے رستے ہوئے ناسوروں

کے علاوج کی خاطر اپنے درد کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ انسانیت سے شدید محبت کرتا ہے۔

اس کو اپنے ماحول کی بے چارگی بے بسی، پریشانی اور افلاس کا شدت سے احساس ہے اور افسردہ ماحول میں وہ اکثر انسانیت کی روح کا متلاشی بھی نظر آتا ہے اور اس کے لئے صدا بلند کرتا بھی۔ وہ فریب دینا بھی خوب جانتا ہے۔ جب کبھی دشمنی پر اُتر آتا ہے تو اُس وقت ساری انسانیت کو بھول جاتا ہے جو اس عہد کے انسان کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ تعصب اور تنگ نظری نے کبھی اس کو چھوا بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بھی اگر بولے گا تو اس طریقے سے کہ آپ کو اس کی حقیقت سے انکار نہیں ہوگا۔ اس کی دو تین تخلیقات پڑھ کر اگر منھ پھیر لیا جائے تو یہ اس کا قصور نہیں...... کسی چیز کے صحیح علم کے لئے گہرا مطالعہ شرط ہے۔ اس شخص سے ہنسی کا مطالبہ جس کا دل زخموں سے چور اور دماغ آلام سے ماؤف ہو خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے...... وہ اکثر سوچتا رہتا ہے اور سوچ کر گہرائیوں میں وہ اتنا ڈوب جاتا ہے جہاں وہ ایک دیوانہ سا لگتا ہے اور سوچوں میں اکثر ڈوبے رہنے کا اعتراف اس نے خود کیا ہے۔ میری نظروں میں ایک آٹوگراف بک گزرا ہے۔ جس میں ملک کے نامور فنکاروں اور سیاست دانوں میں شبنم قیوم کا آٹوگراف ان الفاظ پر مشتمل ہے:

جب مجھے یہ آٹوگراف بک پیش کیا گیا تو میں سوچنے لگا میں اس پر لکھوں تو کیا؟ میں سوچتا ہی رہا۔ اس لئے کہ سوچنا میرا عظیم مشغلہ ہے۔ اس کی بدولت میں کچھ پاتا ہوں اور کچھ کھوتا ہوں...... دستخط

شبنم قیوم میدان ادب میں اُس وقت اترا جب اس کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی۔ ۱۹ سال کی عمر میں اس نے پہلا ناول لکھا...... "زندگی اور موت" اس کا اولین ناول ہے جو جذبات کی گہرائی، یقین کی روشنی اور انقلاب پسند رومانویت کے ساتھ ایک دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول کے کرداروں کی غیر معمولی مقصدیت اور ان کا انقلابی جوش وخروش دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس ناول میں اس کے بلند خیالات، اس کے فن کی پختگی خاص طور

پر ظاہر ہے۔ بین الاقوامی مسائل میں قومی رنگ کو ابھاتے ہوئے اس نے انسانیت کی بنیادی صلاحیتوں پر نظر رکھی ہے اور ایسے کرداروں کو اُبھارا ہے جن کی داخلی کشمکش باریک سے باریک نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس ناول کے مطالعہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اس نے زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی پُرخلوص کوشش کی ہے۔ انسانی فطرت کی بوقلمونی، اس کے تضاد، ضروریات اور چھوٹی بڑی الجھنوں کو جس طرح اس نے پیش کیا ہے وہ محض دلچسپ ہی نہیں بلکہ بصیرت افروز بھی ہے۔ اس کی ناول نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کرداروں کے اعمال کو خیر وشر، نیکی اور بدی یا سود وزیاں کے پیمانے سے ناپنے کا قائل نہیں ہے۔ اس کی کہانیوں میں تلوار کی سی تیزی، آبگینے کی سی نزاکت اور شبنم کا سا حسن ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت پسندی میں زندگی کے گریزاں لمحات کو فن پاروں میں اسیر کر لینے کی صلاحیت، زندگی کی وسعتوں کو سمیٹ لینے کا رجحان متاثر کن ہے۔ اس کے یہاں زندگی کے پراسرار دھندلکوں اس کی پہنائیوں اور سرچشمے کا کھوج لگانے کی آرزو مچلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شبنم قیوم بڑا حقیقت پسند ہے۔ زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرانا خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں اس کی فطرت سے بعید ہے۔ زندگی کے متعلق اس کا نظریہ بڑا صالح اور صحتمندانہ ہے اور اسی بناء پر اس کے یہاں خالی رومان اور خیالی عشق کے ڈھکوسلے جو مریضانہ ذہنیت کو جنم دیتے ہیں، مطلق نہیں۔ ان کی کہانیاں دیکھئے تو ان میں انفرادیت کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آئینگی اور یہ بات کسی ادیب کے فن کے لئے استحکام کی دلیل رکھتی ہے۔ اس کی فطرت کا تیکھا پن، مزاج وارفتگی اور طبیعت کا بانکپن ان کی شخصیت کے ایسے جوہر ہیں جو فنی پختگی کی جلا کر کہانی کی تقلیدی فضا کو تاریکی میں بھی بڑی آب وتاب دکھاتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ روایت اور انفرادیت کا اس کے ہاں متناسب ومتوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسے ہم جنون اور شعور کی صحیح آمیزش بھی کہہ سکتے ہیں۔ اُنہوں نے ہر کہانی کے بنیادی کردار میں ایسی خصوصیت اُبھاری ہے کہ پڑھنے والا چونکے بغیر نہیں رہ سکتا اس کی

افسانہ نگاری ملک کے متوسط طبقے کے مجرم مجبور اور مفلس ضمیر کی فریاد ہے۔ اسے ہمارے

اس ماحول کی بیچارگی، بے بسی، اضمحلال، پریشانی اور تنگدستی کا شدت سے احساس ہے۔ وہ تھکے افسردہ ماحول میں انسانیت کی رمق کی خاطر شدید صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے گہرے مطالعہ سے ان کی تحریر صفحۂ قرطاس پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے تازہ گوشت کے خون آلود لوتھڑے پڑے ہوں۔ اس کی واضح مثال "لنکا کو جلا دو" میں نفسیاتی رد عمل کی تصویروں کے علاوہ ذہنی، آسودگیاں اور جنسی بے راہ رویاں ہیں جو مختلف جگہوں پر بڑی خوبی سے متشکل کی گئی ہیں۔

شبنم قیوم اس زمانہ کی حرکت کو دیکھتا ہے اور اس کی ضرورت کو بیان کرتا ہے۔ وہ اس دور کے مادی وسماجی حقائق کا باریک مبصر ہے۔ ان کے پاس حسن ادراک، تشکیک، تخیلی پیش بینی، یادیں، حقائق کا ایمان اور ہر قدر کی خاموش قدر شناسی کے عناصر موجود ہیں اور یہی عناصر ان کو ایک مکمل فنکار بناتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی عمر مختصر ہے اور اس مختصر سے عرصے میں وہ اپنے افسانوں کے لئے براہ راست زندگی سے مواد حاصل کرنے اور فن کو جلا بخشنے کے لئے لگاتار محنت، دلچسپی اور لگن سے یہ سفر طے کر رہا ہے۔ ان کے اپنے تجربات ومشاہدات نے اس کو اس بڑے شعور سے ہم آہنگ کر دیا جس میں نبض گیتی کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ اس کے افسانوں کے کرداروں کی اپنی اپنی دنیا ہے۔ وہ فیصلے دوسروں پر نہیں چھوڑتا...... اچھے بُرے جیسے بھی ہوں، فیصلے اور پسند و ناپسند اس کی اپنی ہوتی ہے۔ ان کے فیصلوں سے اختلاف ممکن ہے، لیکن ایک عام قاری بھی ان کے افسانوں میں وقت کی بے راہ روی، ذہنی کشمکش بھوک اور پیاس کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے کردار زندہ کردار ہیں۔ وہ اپنی دنیا خود بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ شبنم قیوم کو کہانی لکھنے کے فن پر قدرت تامہ حاصل نہیں ہے لیکن ایسے معمولی واقعات اور حادثات جو ہماری اور آپ کی نظروں کے سامنے سے اکثر بیشتر متوجہ کئے بغیر گزر جاتا ہیں اُن کے پاس پہنچ کر واقعی معجزے بن جاتے ہیں۔ اس کی تازہ

مثال ''زخمی معجزے'' ہے

شبنم قیوم زیادہ تر طویل افسانے لکھتے ہیں۔ اس کے طویل افسانوں کے بارے میں سید احتشام حسین کا لطیفہ، جب بھی میں اس کا کوئی نیا افسانہ پڑھتا ہوں، یاد آتا ہے......احتشام صاحب ایک روز ان کے ہاں کھانا کھا رہے تھے۔ جب اُنہوں نے ایک کے بعد ایک سلونا آتے دیکھا تو شبنم صاحب سے فرمایا: اس کی کیا ضرورت ہے یہ تو بہت ہے۔

شبنم قیوم نے ازراہ مہمان نوازی جواب دیا۔ یہ تو ہم نے مختصر بنایا ہے۔ احتشام صاحب بیساختہ بول اُٹھے: ارے! یہ مختصر ہے؟ یہ تو طویل افسانہ ہے''۔

شبنم قیوم کا فن اس کے قلم کی نوک پر سیاہی کے قطرے میں ہوتا ہے۔ وہ کہانی لکھنے کا موڈ زبردستی اپنے اوپر طاری نہیں کرتا۔ نہ ہی گھنٹوں بیٹھ کر پلاٹ کا تعین کرتا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں۔ کہانی کو جنم دیتا ہے۔ وہ مسائل حیات میں چلتے پھرتے مواد اکٹھا کرتا ہے۔ اس نے ملک اور قوم کر ہر پہلو سے دیکھا ہے اور سماج کی خامکاریوں کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں سیاسی، معاشی، معاشرتی تبدیلیوں کا عکس پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ انقلاب پسند ہونے کیساتھ اصلاح پسند بھی ہے۔ اس کی مثال '' پرانی ڈگر نئے قدم'' میں ملتی ہے۔ بظاہر اس ناول کا موضوع غنڈہ گردی کا وہ دور ہے جب جمہوریت کا خون ہو رہا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا موضوع جنس اور صرف جنس ہے لیکن مصنف صرف جنسی بصیرت کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو صرف جنسی چولا پہنا کر ہم سے متعارف نہیں کرتا بلکہ وہ جنسی نفسیات کی کسوٹی پر اُس کردار کو پرکھتا ہے جس سے صرف کردار ہی نہیں حالات و واقعات بھی متاثر ہوتے ہیں۔

اس نے جنس کے ہر معاشرتی اور نفسیاتی پہلو کو اس ناول میں اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس نے اس دور پر ایک بھرپور تھپڑ اور ایک زوردار تازیانہ لگایا ہے جس میں نہ صرف شریف عورتیں اپنی عزت محفوظ نہیں سمجھتی تھیں۔ بلکہ خوبصورت مرد بھی اپنے گریبانوں

میں منھ ڈالا کرتے تھے......، اس ناول کو جو انفرادیت حاصل ہے وہ مسلمہ ہے۔ اس نے ناول میں سماج کی نت نئی مگر مذموم باتوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ قوم پر تازیانے لگائے ہیں اور وطن کی حمیت کو جھنجھوڑا ہے......اس نے قومی تہذیب کے اجڑتے، اس کے وقار کو گرتے اور اس کی آن پر دھبہ لگتے دیکھ کر ایک ایسی چیخ ماری ہے جس میں زلزلہ کی سی قوت موجود ہے۔ اور یہی چیخ ''پرانی ڈگر نئے قدم'' کہلاتی ہے ایسی ہی ایک اور چیخ اس نے اپنے دوسرے ناول ''چراغ کا اندھیرا'' میں بھی لگائی ہے۔ مگر اس میں انہوں نے سماج کے غنڈوں، قوم کے لیڈروں اور ملک کے دشمنوں کے بجائے حاکموں اور سیاسی ٹھیکیداروں پر ایسی ضربیں لگائی ہیں جو متاثر کن ہیں۔ اس ناول کے موضوع کے حقیقی ہونے کا ہر ایک کو اعتراف ہے۔

ناول کی کسوٹی پر جب ہم شبنم قیوم کے ناول یہ دیکھنے کے لئے پرکھتے ہیں کہ آیا یہ اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں یا نہیں تو ہمیں بیک وقت ہاں اور نا کرنا پڑتا ہے۔ ہاں اس لئے کر رہے ہیں کہ شبنم قیوم ناول کے فن سے پورا واقف ہے اور اس کا ہر ناول زندگی سے بھر پور ہے اس میں ایسی کمزوریاں بھی جھلکتی ہیں جو بُری طرح کھٹکتی تو نہیں لیکن اس کے فن پر اپنا اثر ضرور ڈال رہی ہیں۔ شبنم قیوم کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے بارے میں ضیاء عظیم آبادی نے ایک مقالے میں لکھا ہے:

''شبنم قیوم ناول نگار افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو اس صنف سے فطری مناسبت ہے اور اس کا اندازِ تحریر بتا رہا ہے وہ بلاشبہ مستقبل کے عظیم ناول نگار اور افسانہ نگار ثابت ہوں گے۔ وہ قاری کی سطح پر آ کر نہیں بلکہ قاری کو اپنی سطح پر لا کر لکھتے ہیں۔ ان کے ناول اور افسانے میں کہیں بھی نا سمجھ لوگوں کو خوش کرنے کی کوششیں نہیں ملتی۔ بلکہ ان کے ہر قدم پر بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا فنکار بالغ نظر ہے، اپنے پہلو میں دردمند دل رکھتا ہے اور جیتا جاگتا مرقع پیش کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شبنم قیوم کا قلم ابھی رُک رُک کر چلتا ہے۔ اس میں تلوار کی سی کاٹ

نہیں آنے پائی ہے"۔

شبنم قیوم خوش نصیبی سے کشمیری ہے...... کشمیریوں کا اپنا مزاج اور کلچر ہے۔ وہ نہ دوسروں پر اپنی روایات کا بوجھ لادنا چاہتے ہیں، نہ خود کسی کی روایات کے احترام میں خود فراموشی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور جاننے کے لئے دیدۂ بینا کی ضرورت ہے۔ دور سے نظارہ کرنا فیضیاب نہیں کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے اب تک یہاں کی روایات اور ماحول پر قلم اٹھایا ہے، انہوں نے اس کا نظارہ دور سے کیا ہے۔ اسی لئے کسی کی تخلیق میں صحیح کشمیر دکھائی نہیں دیتا۔ ایمل زولا نے بتایا ہے۔ ناول کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ جس عہد میں لکھا جائے اس عہد کی جیتی جاگتی تصور نظر کے سامنے کھڑی کر دے۔ شبنم قیوم کے ناولوں اور افسانوں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ کردار نگاری کے بارے میں بھی شبنم قیوم ایک کامیاب ناول نگار کہلانے کا مستحق ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی پیش کیا حقیقت پر مبنی ہے۔

"شبنم قیوم آدرش داد کا نعرہ لگانے والوں میں نہیں ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند فنکار ہے۔ اس کے یہاں سچائی گام گام پر اپنے جوہر دکھاتی ہے۔ وہ زہر کو قند کہہ کر معاشرے کی گندگی بڑھانا برداشت نہیں کرتے بلکہ ایک مخلص معالج کی طرح پہلے ہی قدم پر رہنے والے ناسور کا سدباب کرنا ضروری سمجھتے ہیں (ایک مصنف ایک تصنیف)

ہمارے ادب میں شخصیت پرستی کی وبا بڑے زوروں سے پھیلتی جارہی ہے۔ من قال کی عظمت نے ما قال کی اہمیت کو تقریباً معدوم کر دیا ہے۔ حالانکہ ادب زبان و مکان اور اشخاص سے ہمیشہ بالا رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی ابدیت اور آفاقیت کبھی مسلم نہیں ہو سکتی تھی۔ ہمارے نقاد جب بھی شہب قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں تو داؤ پیچ سے آگے نہیں بڑھتے اور وہ صرف بڑے بڑے ناموں کے گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان قدیم و جدید ادیبوں و شاعروں کے جواہر پاروں کو منظر عام پر لایا جائے جو غیر معمولی فنکارانہ صلاحیتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ شخصیت

پرستی اور ناقدری نے ملک کے کتنے ہی قابل جوہروں کو شہرت دوام اور قدر عام سے محروم کر دیا ہے۔

شبنم قیوم ہندوستان کا ابھرتا ہوا فنکار ہے۔ ایڈیٹر نگارش امرتسر مہندر باوا نے ان کو کشمیر کا اے حمید لکھا ہے۔ ان کے فن کو ایک لمبے عرصے تک نظر انداز کرنے کے بعد خوش قسمتی سے اب کئی جانب سے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور توقع کی جاتی ہے۔ شبنم قیوم اُردو ادب میں جلد ہی وہ مقام حاصل کرے گا جس کا وہ صریحاً طور پر مستحق ہے۔ (ماہنامہ ''مزاج'' بھوپال۔ مارچ ۱۹۶۷ء)

کرشن چندر کے قلم سے

شبنم قیوم کو کہانی کا فن آتا ہے۔ اور ان کے ہاں وادئ کشمیر کی زندگی کا متنوع مشاہدہ موجود ہے۔ اور اسے نفسیاتی طور پر جذب کرنے اور پھر فکر و فن کے سانچوں میں ڈھالنے کی قوت بھی! شبنم قیوم واقعیت اصلیت اور حقیقت کی عکاسی میں کہیں کہیں شاعرانہ انحراف کے قایل بھی نظر آتے ہیں۔ ادب میں اگر فنکار تصوف یا غلو سے کام نہ لے تو ادب اور فوٹو گرافی میں کیا فرق رہ جائے۔

شبنم قیوم کے افسانوں میں درد اور تڑپ ہے زندگی کی گہرائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی زبان اور اس کا پیرائیہ بیان دونوں عمدہ ہیں۔ مشق سے یہ پیرائیہ بیان اور بھی نکھر جائے گا۔

شبنم قیوم بالعموم اپنے افسانوں میں قاری کی دلچسپی قائم رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے بنیادی کردار میں ایسی خصوصیت اُبھر آتی ہے کہ پڑھنے والا چونکے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ افسانے کو کسی ایسے موڑ پر لا کھڑے کرتے ہیں جہاں پوری کہانی ایک سوال بن جاتی ہے۔ اور خود جواب دینے کے بجائے قاری سے جواب مانگتی ہے۔ ان کے طویل افسانوں کا مجموعہ ''ایک زخم اور سہی'' اس کی ایک مثال ہے۔

شبنم قیوم ایک نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ اگر انہوں نے اسی دلی لگن سے کام لیا اور متواتر کام لیا تو مجھے یقین ہے ان کی فطری صلاحتیں اور بھی ابھریں گی اور ایک دن وہ قدر اول کے افسانہ نگار ثابت ہوں گے

سرینگر ٹورسٹ ریسپشن سنٹر گیسٹ ہاؤس

(۳ جولائی ۱۹۷۰)

آ، اب لوٹ چلیں

مئی کے پہلے ہفتے میں ہمارے اخبار ''قومی وقار'' کے دفتر پر دو افراد آ گئے۔ یہ دونوں ''شبنم قیوم'' سے ملنا چاہتے تھے۔ ان میں ایک بالغ مرد تھا اور دوسرا لڑکا تھا۔ تعارف مکمل کرتے ہوئے جوان لڑکے نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں کشمیر کے افسانہ نگاروں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جب ریاست کے افسانہ نگاروں کی فہرست مرتب کی گئی تو......ظاہر ہے شبنم قیوم کے بغیر یہ فہرست نامکمل تھی، لہٰذا ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آپ ہمیں اپنی زندگی کے حالات، ایک عدد افسانہ اور اپنا فوٹو گراف عنایت کریں۔

میں نے ان سے وعدہ کیا ایک ہفتہ کی مہلت کے بعد آپ کو اپنی مطلوبہ چیزیں دی جائینگی۔ چنانچہ وہ ہم سے یہ وعدہ لے کر رخصت ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد اخبار ''قومی وقار'' کی چیف ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھ کر میں سوچنے لگا......، اس کا مطلب ہے۔ میں ابھی بحیثیت افسانہ نگار زندہ ہوں۔

حالانکہ میں برسوں سے ادب اور ادیب کے زمرے میں ایک طرح سے خود کو مرا ہوا پاتا ہوں۔ اور مانتا بھی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ۱۹۷۰ء تک میں ادب کی دنیا مین ڈوبا ہوا تھا۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۷۰ یعنی ادب کی زندگی کے ۲۰ سال تک میں نے دو ناول، تین ناولٹ ۱۵۲ افسانے اور ۲۲ ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے لکھے۔ اسٹیج کے لئے صرف چند ڈرامے ہی لکھ سکا۔

ادب کی دنیا میں قدم رکھ کر مجھے سنگلاخ زمین پر چلنا پڑا، ابتدا کے چار برسوں تک

زبردست حوصلہ شکنی ہوئی، البتہ میں نے ہمت نہ ہاری، نہ ہی روٹھ کر الگ تھلگ بیٹھا بلکہ میں لکھتا رہا۔ میرا پہلا افسانہ ''جہاں انسان دفن ہے'' جب شائع ہوا تو یہ بیک وقت انگریزی، ہندی، پنجابی اور بنگالی میں ٹرانسلیٹ ہوکر بڑا مقبول ہوا۔ میرا پہلا ڈرامہ ''یاد گار'' نے یقیناً یادگار بن کر شہرت کا دوام حاصل کرلیا۔

میرا قلم چلتا گیا۔ ہندوپاک کے رسائل میں افسانے چھپتے رہے۔ لگ بھگ ۱۵ افسانے ملکی اور بین الاقوامی زبانوں میں شائع ہوئے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب مجھے افسانہ نویس کے ساتھ زودنویس کہا گیا۔ میرے دوناولٹ ''پرانی ڈگر نئے قدم'' اور ''چراغ کا اندھیرا'' اتنے مقبول ہوئے کہ مجھے خود بھی یقین نہیں آیا یہ میرے قلم کی جولانیاں ہیں۔

ابتدائی دور کے افسانے جو پبلشروں سے واپس آگئے۔ ان کو چھوڑ کر میرے ڈیڑھ سو افسانے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تو افسانہ نگاروں میں میری بھی پہچان ہوگئی۔ میرے ناول ناولٹ اور افسانے تنقیدی کسوٹی پر پرکھے جانے لگے۔ میری زندگی اور ادب پر مقالے شائع ہونے لگے۔

فن اور ادب کے میدان میں، میں گامزن تھا کہ ۱۹۷۱ء میں اس میدان سے نکل کر میرے سامنے ایک موڑ آگیا۔ حالات نے مجھے ایک ایسی ڈگر پر لایا جہاں ادب نہیں سیاست تھی۔ اور جب میں نے خود کو سیاسی میدان میں دیکھا تو یہاں بھی ادب کا دامن نہیں چھوڑا میں نے ۱۹۷۵ء میں سیاسی پس منظر میں ایک ناول لکھا اس کا نام ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟ رکھا۔

یہ ناول میری ایک پہچان بن گئی۔ اس نے مجھے شہرت دوام کے ساتھ دولت بھی دی البتہ اس نے ایک بڑا نقصان بھی کردیا یعنی مجھے ادب کی طرف مڑ کر دیکھنے بھی نہیں دیا حالات نے مجھے ادب کے میدان سے نکال کر تاریخ نویس بنادیا تاریخ سے سیاست اور پھر صحافت میں لاکر کھڑا کردیا۔ یہاں آکر میں واقعی ادب اور فن کو بھول گیا۔ اگر یہ کہا

جائے بحیثیت ایک ادیب کے میری موت ہوئی تو غلط نہیں ہوگا۔

آج جب ایک جوان نے آکر مجھے یاد دلایا آپ بحیثیت افسانہ نگار ابھی زندہ ہیں تو میں نے خود کا جائیزہ لیا۔ کافی غور وخوض کے بعد میں نے خود سے کہدیا۔ آ، اب لوٹ چلیں...... یعنی ادب کی راہ پر دوبارہ چلیں۔

میں نے ادب میں واپس لوٹ آنے کا فیصلہ کیا اور اب تک کہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ افسانوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور جب میں نے اس کا بیڑا اٹھایا تو ایک زبردست صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی میرے زخم تازہ ہوگئے۔ مجھے یاد آیا......، میں آپ کو بتادوں، ہمارا آبائی گھر بچھوارہ ڈلگیٹ میں تھا۔ یہاں ہم چار بھائی اکٹھے رہا کرتے تھے۔ البتہ جب چاروں کا عیال بڑھ گیا تو ہم نے الگ الگ گھر بنانے کے لئے کمر باندھے۔ مجھے شومئے قسمت سے چھانہ پورہ جا کر بس جانا پڑا۔ میں نے بچھوارہ کے آبائی گھر سے جب چھانہ پورہ شفٹ کرلیا اس وقت صرف گھریلو ضرورت کا سامان اٹھا کر ساتھ لایا۔ اپنا ادبی لٹریچر، اپنی طبع زاد اور غیر مطبوعہ افسانے ناول اور دوسرا لٹریچر کتابیں بوریوں میں بند کر کے رکھدیا تا کہ جب چھانہ پورہ میں پوری طرح گھر بس جائے گا تو پھر اس سارے مواد اور لٹریچر اور کتابیں لائبریری میں سجاؤں گا۔

چنانچہ جب میں ایک مدت کے بعد پرانے گھر سے علم و ادب، لٹریچر کتابیں میگزین لانے گیا تو پتہ چلا وہ سب ردی میں بک گیا ہے۔

یہ صدمہ جانکاہ، عزیز اولاد کے فوت ہونے سے کم نہ تھا۔ زیادہ افسوس ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ناول ناولٹ افسانوں اور ڈراموں کے ردی میں فروخت کئے جانے کا ہوا جن کا میرے پاس کوئی ریکارڈ نہ رہ سکا۔

کچھ رسالے ضرور بچ گئے۔ اور کچھ تلاش بسیار کے بعد حاصل کر لئے۔ اب یہی بچے کچھے مطبوعہ افسانے کتابی صورت میں ''نشانات'' کے نام سے جمع کرسکا ہوں۔ تا کہ خود کو وہاں اُس دور سے نکال باہر لاؤں جہاں میری بحیثیت ایک ادیب کے میری

موت ہوئی تھی۔

۱۹۶۰ء سے لیکر ۱۹۷۰ء تک یعنی ادبی زندگی کے بیس سال کے درمیان جو کچھ میں نے افسانوں کے نام سے تحریر کیا اس میں صرف یہی کچھ بچایا گیا ہے۔ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ ان افسانوں کے بارے میں آپ کیا فیصلہ کر سکیں گے۔ وہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے البتہ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں۔ جو کچھ بچ گیا ہے وہی پیش کر رہا ہوں۔ ماضی کے یہ ''نشانات'' اب حال میں مستقبل کے لئے محفوظ کر رہا ہوں۔ اور اس کا کریڈت میں ان دو احباب کو دے رہا ہوں جنہوں نے مجھے احساس دلایا بحیثیت ادیب اور افسانہ نگار آپ ابھی زندہ ہیں۔

شبنم قیوم

دُکھتی آنکھیں

درگجن کے چسٹ ڈزیز ہسپتال کے احاطہ میں بیٹھے ہوئے بوڑھے نے جب گریبان سے سر نکال کر بیمار بیوی کی طرف کنکھیوں سے دیکھا تو اسے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے دق کی مریضہ کو اب بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ہسپتال میں آئے ہوئے یہ ان کا تیسرا دن تھا۔ اور ان تین دنوں میں بیوی نے کئی بار اس سے پوچھا تھا۔

''جب تم رشید کو یہ کہنے گئے تھے کہ تیری ماں بیمار ہے۔ اور وہ ہسپتال میں داخل ہو رہی ہے۔ تو اس نے تمہیں کیا جواب دیا تھا...... وہ اب تک یہاں کیوں نہیں آیا؟''

بوڑھے نے اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا، دفعتاً اس پر سکتہ سا طاری ہوا اس نے تھوڑی دیر کا سکوت توڑ کر کہا۔

''فاطمہ! اب دیر ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر تجھے اس وقت تک یہاں دیکھے گا تو......''

''آں...... ہاں! میں...... مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔ اب میں لیٹ جاؤنگی''

اور بوڑھی مریضہ وارڈ نمبر ۴ میں جب اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تو بوڑھا تھوڑی دیر تک وہیں منڈلاتا رہا۔ پھر باہر نکل کر احاطہ کے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگا۔

جب سے فاطمہ دق کے مرض میں مبتلا ہوئی، جب سے بوڑھے سلطان نے اس کی دل بہلائی میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن ہسپتال میں آنے کے بعد خود اس کی حالت قابل التفات تھی۔ خاص طور پر ہسپتال کے کسی ماہر ڈاکٹر کے لئے جو اس کے معائینے کے بعد اس کے لئے بھی بیڈ کا انتظام کرواتا اور اس طرح میاں بیوی ہسپتال کے ماحول میں اپنی اپنی زندگی کے بقیہ ایام پورا کرتے۔

بوڑھی فاطمہ اس وقت بھی بیڈ پر دراز جوان بیٹے کی یاد میں اسی طرح وقت گزار

رہی تھی جس طرح کوئی سادھو بھگوان کی یاد میں اپنا وقت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے باہر

احاطہ کے ٹیلے پر بیٹھ کر بوڑھے کو اس بات کا پورا پورا احساس ہو رہا تھا۔ مگر......شاید اب وہ اس بارے میں اپنے آپ کو بے بس، لاچار اور معذور جان رہا تھا۔ اور اسے رہ رہ کر بیٹے رشید کا جواب کچوکے دے رہا تھا۔

سر بہ گریبان ہو کر وہ اسی بے بسی میں الجھا ہوا تھا۔ کہ اس نے ایک دلدوز آہ بھرتے ہوئے سر کو اُٹھایا۔ آنکھوں کو مل کر جونہی اس نے نگاہوں کو پھیلایا اس کی نظر پرانے گرجے کے مینار کی طرف اٹھ گئی جس گرجے میں وہ بچپن میں حضرت عیسیٰؑ کے پھانسی پر لٹکانے کی فلم دیکھا کرتا تھا۔

آج سے تقریباً پچاس ساٹھ برس پہلے، جب بوڑھا اسی علاقے میں بچپن کی کھیل کود میں مصروف تھا۔ جب یہ ہسپتال انگریزوں کا مشن ہسپتال کہلاتا تھا۔ مگر آج......، آج تو یہ چسٹ ڈیزیز ہسپتال کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔

جس طرح وقت اور زمانے نے مشن ہسپتال کو چسٹ ڈزیز ہسپتال میں بدل دیا۔ اسی طرح عمر کی رفتار نے سلطان کی زندگی کو جوانی سے بڑھاپے میں منتقل کیا۔

اس گرجے کے مینار کے عقب میں سورج افق کو ارغوان زار بنا رہا تھا۔ یہی مینار بوڑھے کو پرانی چیز اور ارغوان زار افق پرانی یاد دکھائی دی......افق کے شفق زار میں دہکتا ہوا پرانا سورج جو زندگی کی بہاروں میں بھی بالکل اسی گرجے کے عقب میں ڈوبا کرتا تھا......اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چاند ہو یا سورج ہر ایک اپنے اپنے وقت پر اُبھرتا اور ڈوبتا ہے چاہیے وہ انسان کی آبادیوں پر اُبھرے یا بربادیوں میں ڈوبے اسے انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کوئی غرض نہیں۔

بوڑھے کے سامنے یہ وہی مقام تھا۔ لیکن پرانی یادوں کے کہر میں سے اس مقام کی جو دلفریبیاں جھ[illegible]تی تھیں۔ وہ، وہ شاید مردہ انسانوں کی طرح دفنائی گئی تھیں۔

اسی طرح جب سورج ڈوب گیا۔ [illegible]ورتا[illegible]یکی نے دن بھر کی چھل پہل کو رفتہ رفتہ

جذب کرلیا۔ تو یونہی خلا میں تاکنے لگا۔ اور اس انداز سے تاکنے لگا گویا خلا اسے بچپن کی یاد دلا رہا تھا۔

آج سے بہت پہلے گویا کل ہی کی بات تھی۔ اسے اس بات کا کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ ڈلگیٹ کے رنگین لمحات کو گزرے نصف صدی ہوئی ہے جس نصف صدی میں آبادیاں ویران اور ویرانیاں آبادیاں بن گئی ہیں۔

انسان کا حافظہ دردناک واقعات کو بہت جلد نہیں تو آہستہ آہستہ بھلا ہی دیتا ہے۔ مگر خوشگوار یادوں کے لئے ہمارا وسیع خلا کبھی آسمان بن کر چھا جاتا ہے۔ کبھی سورج اور چاند کو چمکاتا ہے۔ کبھی بجلیاں چمکاتا ہے اور کبھی تاروں کو ٹمٹاتا ہے اور اسی خلا نے بوڑھے کو نصف صدی پہلے کی دنیا میں ڈھکیل دیا۔

بوڑھا سلطان اصل میں اسی ڈلگیٹ کا باشندہ تھا۔ بچپن میں اس نے پہلے عشق کیا، پھر شادی کر لی تھی اور بیوی کو لے کر وہ والدین کی نظروں سے دور اس علاقہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر چلدیا تھا۔ بچپن تو اس نے نہایت ہی خوشگوار گزارا تھا۔ مگر بچپن کے آنگن سے نکل کر جب جوانی کے میدان میں اُتر آیا۔ تو اسے زندگی کے نشیب و فراز سے بری طرح دوچار ہونا پڑا...... شادی کے تیسرے سال وہ ایک بیٹے کا باپ بنا لیکن یہ بیٹا کم سنی ہی میں اسے داغ مفارقت دے گیا۔ اسی طرح جب یکے بعد دیگرے تین بیٹیوں اور دو بیٹوں نے وقت بہ وقت جنم پا کر داغ مفارقت دیا تو بیوی سمیت اس کی زندگی...... اور اس زندگی کی رمق ہی اکارت ہو گئی؟ اسطرح ان کی دنیا ہی لٹ گئی اور جہاں...... وہ تو گھناونا اور تاریک ہو کر رہا۔

آخر خدا کی بارگاہ میں جبہ سائی کر کے خدا نے انہیں ایک اور اولاد سے نوازا جس کو یہ دونوں زندہ اور مردہ ایک ساتھ جان رہے ہیں۔ کیونکہ اسی اولاد کی لاپروائی نے انہیں دق کے مرض میں مبتلا کیا۔

اس وقت خلا کو تاکتے ہوئے اسی اولاد کی حرکات و سکنات تصویر کی صورت میں

ایک دکھیارے باپ کے دل پر اُبھر رہی تھی۔ اور اسی اولاد کو ماں کی ممتا اسی طرح یاد کر رہی تھی۔ جس طرح ایک مصیبت زدہ آدمی خدا کو یاد کرتا ہے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا اور بوڑھا ابھی تک خلا کو تک رہا تھا۔ یکا یک اسے اپنی بینائی کی کمزوری کا احساس ہوا اور اس احساس نے اس کے تن و بدن میں ایک ایسی حرکت پیدا کر دی کہ وہ اٹھ کھڑا ہو کر یہاں سے چلدیا......، ان کی چند سیڑھیاں اترتے ہی وہ غیر ارادی طور سے رک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ دفتر میں رشید سے مل کر گھر لوٹ رہا ہے......وہ سیڑھیاں بھی ایسی ہی تھیں۔

آج سے چند روز پہلے رشید کی زبان سے نکلی ہوئی زہریلی آواز جو اسکے تن و بدن میں ایک ہیجان بپا کر گئی تھی۔ اب بھی اسکا تعاقب کئے ہوئے تھی۔

بوڑھا نہ جانے کب تک اسی طرح پڑا رہتا کہ فضا کی بڑھتی ہوئی تاریکی نے اسے ڈیرے پر جلدی سے پہنچنے کی ترغیب دی۔

دوسرے دن صبح بوڑھا دل بہلانے کی غرض سے بیوی کو دھوپ سینکنے کے لئے باہر لے آیا۔ ہسپتال کے احاطہ میں جہاں پر بیمار اور ان کے تیمار دار دھوپ سینکنے جمع ہو رہے تھے۔ بوڑھا اس سے آگے سبھوں سے الگ تھلگ اپنی مریض بیوی کو لے جا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دئے ایک دوسرے کے سہارے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھے۔ ان کے نحیف پیکروں کو دیکھ کر ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ گویا خزان کے اس موسم میں دو سوکھے پیڑ بچپن کی بہار کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔

چلتے اور بڑھتے ہوئے بڈھیا کے جسم میں درد کی ٹیس سی اٹھنے لگی۔ بوڑھا اس کی حالت کو بھانپ گیا اور بے تاب ہو کر بولا

"فاطمہ! تھوڑی دیر ستالو، پھر......

"نہیں......، چلو! بڑھیا نے مایوسی کی لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

نومبر کی دھوپ سینکنے جب دونوں ایک جا بیٹھ گئے تو دونوں نے ایک دوسرے کو بھر

پور نظر سے دیکھا۔ اس نظر میں جو ایک ساتھ جینے اور ایک ساتھ مرنے کا عزم رقصاں تھا۔ وہ انہیں بچپن کے خوشگوار زمانے میں کیا ہوا وعدہ یاد دلا رہا تھا۔

ایک دوسرے کو بغور دیکھتے ہوئے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈال کر گھورتے ہوئے جب سامنے حجاب ناچنے لگا تو دونوں نے زیر لب مسکرا کر نگاہوں کو اپنے اپنے دامن پر مرکوز کر لیا۔ دونوں میں تھوڑی دیر تک گومگو کی کیفیت طاری رہی کہ بڑھیا نے آہستہ سے سر اُٹھا کر اور تیقن سے دیکھتے ہوئے بوڑھے سے کہا

''میری آنکھ دُکھتی ہے۔ شاید......

''آزمائش کی ہے؟'' اس نے فوراً پوچھا

''ہاں! بشارت ہے......، شاید رشید آجائے گا''۔

رشید کے آمد کی بشارت پا کر بوڑھے کو قدرے ڈھارس ہوئی۔ لیکن دوسرے لمحے......، وہ حسرت بھری آہ کھینچنے کو تھا کہ اسے سامنے دِق کی مریضہ کے سامنے آہیں بھرنے کا احساس ہوا۔

اب وہ اس کی ڈھارس بندھانے اور دل بہلانے کا کوئی موضوع ڈھونڈنے لگا۔

خوشگوار یادوں کے لئے اگر ہمارا وسیع خلا درخشان رہتا ہے تو پھر بوڑھے کے سامنے ماضی کی خوشگوار یاد تصویر بن کر کیوں نہ آتی؟

یکا یک اس کے لرزتے ہونٹوں پر تبسم کی لہر سی دوڑ گئی اور اسی کیفیت میں وہ بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''فاطمہ! تمہیں کچھ یاد ہے؟''

بوڑھی کے خشک ہونٹوں پر لرزش سی آگئی۔ اور بولی...... ''کیا...... کیا یاد ہے؟''

بوڑھے نے تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پھر اس کے گھمبیر چہرے کو کنکھیوں سے دیکھ کر بولا'' فاطمہ! میرا دل کہتا ہے۔ آج ہم پرانے ارمانوں کے باغوں میں اپنی روح اور ضمیر کے جذبوں کو ڈھونڈ نکالیں جو عرصہ ہوا اسی ڈلگیٹ میں پیدا ہوئے تھے۔

بڑھیا نے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا'' تو...... تم بچپن کے زمانے کو عرصہ تو نہیں کہتے ہو؟''

بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا'' دراصل بات یہ ہے کہ...... ہاں! مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ گویا کل کی ہی بات ہے......، تمہیں یاد ہے نا، یہاں ہم نے کیسے کیسے دن اور کیسی کسی شامیں ایک ساتھ گزاری تھیں...... وہ دیکھو نا، ناشپاتی کا درخت، اب یہ بھی ہماری طرح بوڑھا ہو گیا ہے اُن دنوں جب ہم اس کا پھل کھایا کرتے تھے۔ وہ جوان تھا بے چارہ......! اب تو شاید یہ بھی سوکھ گیا ہے...... فاطمہ! جس طرح سوکھا پیڑ پھل نہیں دیتا۔ اسی طرح بوڑھا آدمی......!''

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ تھوڑی دیر بعد متاسفانہ انداز میں بولا۔

''فاطمہ! اُن دنوں تجھے اولاد کی زیادہ تمنا تھی نا؟!''

یہ سنتے ہی بڑھیا کے سوکھے پتلے جسم میں ایک تند آندھی سی آئی جس نے اسے بڑھاپے کی منزل سے کسی دشت نامعلوم کی طرف پہنچا دیا۔ بوڑھا اس کی حالت پر من ہی من میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ اور پھر پینترا بدل کر بولا۔

''فاطمہ ادھر دیکھو میری طرف......، وہ ہسپتال کے بائیں باغ کے اُس سرے پر جو عمارت ہے...... ہے نا؟'' بوڑھی نے عمارت سے نگاہیں ہٹا کر سلطان کے چہرے کو بھرپور نظر سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن ساتھ ہی خاموش زبان میں اس کا مطلب پوچھا تو بوڑھا مصنوعی مسکراہٹ سے بولا۔

''اُن دنوں ہم نے جو آپس میں ملنے کی جگہ منتخب کر رکھی تھی وہ...... وہ یہی عمارت ہے نا، اور اُن دنوں......، تم کو یاد ہے نا؟ اپنے اپنے گھروں سے بھاگ کر ہم اسی عمارت میں چھپ رہے تھے......، اور پھر جب ہم نے چوری چھپے شادی کر لی تو...... ہاں! وہ بوڑھا دھوبی، تجھے یاد ہے نا......، اس نے ہمیں اولاد کی طرح چھپائے رکھا تھا...... نہ جانے کب کا مر چکا ہوگا بے چارہ!''

بوڑھی نے لمحہ بھر کے لئے حافظے پر زور دیا اور زیر لب مسکرا کر کہا۔

''آں...... ہاں یاد ہے''۔

''ان دنوں میں کتنا سرکش ہوتا تھا...... تم بے حد خائف رہتی تھیں''۔

بوڑھی کے خشک ہونٹوں پر تبسم سا آ گیا۔ وہ بچپن کے سرکش عاشق کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی اور نگاہوں ہی نگاہوں میں بولی...... ''تمہاری سرکشی میں لگاؤ کا پہلو جھلکتا تھا...... میرے سرتاج!''

''فاطمہ! تجھے یاد ہے؟ ہماری وہ پہلی ملاقات، گویا کل ہی کی بات ہے۔ تم اپنی ماں کے ساتھ نہ جانے کیا کرنے یہاں آئی تھیں۔ اسی ہسپتال میں، میرا باپ یہاں نوکری کرتا تھا...... کرتا تھا نا؟ میں اُس کے لئے کھانا لے کے آیا تھا۔ اور یہیں پر میں نے تمہیں......'' نہ جانے بوڑھا آگے کیا کہنے والا تھا کہ بوڑھی نے اپنے بچپن کے عاشق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا۔

''...... میں بہت حسین تھی نا؟ اسی لئے مجھے دیکھتے ہی تم میرے گرویدہ ہو گئے......''

''ہاں یہی بات ہے۔ مگر......'' بوڑھا خاموش ہوا اور کچھ سوچ کر بولا ''فاطمہ! ایک بات بتاؤ، اُن دنوں میں تجھے کیسا لگ رہا تھا۔ میرا مطلب...... اگر تجھے بھی میری سچی محبت تھی۔ تو...... تو مجھے کبھی کبھار طعنے کیوں دیتی تھی''۔

''مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ ویسے اگر میں نے کبھی کبھار ایسا کیا ہو، تو اس لئے کہ تم نے میرے آنے جانے کو دوبھر کر دیا تھا''

بوڑھی نے عذر پیش کیا تو اس عذر سے بوڑھے کا دل یونہی پسیجا، اسے اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسا کہ وہ بوڑھا نہیں بلکہ جوان سلطان تھا۔ جس کے پہلو میں دوشیزہ فاطمہ اپنے بے قصور ہونے کی صفائی پیش کر رہی تھی۔

دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ اور پھر بوڑھے نے اس انداز سے سکوت کو توڑا گویا اسے کوئی کھوئی ہوئی بات یاد آ گئی ''اوہ ہاں! وہ عہد...... تم کو یاد ہے نا؟ شادی

کے روز ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کا عہد کیا تھا...... کیا بچپن تھا وہ......؟ ویسے عمر کے لحاظ سے ابھی ہم اتنے بوڑھے نہیں ہیں، جتنے دکھائی دے رہے ہیں۔ خدا کو یہی منظور تھا، جو اُس نے ہماری تمناؤں کو کچل کر ہمیں پائمال کیا...... تمہیں یاد ہے نا؟ شادی سے پہلے جب ہم اپنے اپنے گھروں سے بھاگ نکلے تھے، تو ہمیں شادی رچانے کی کتنی فکر تھی۔ اور جب شادی ہوگئی تو...... شادی کے بعد ہم اولاد کے لئے کتنے ترستے تھے۔ مقدر کا کھیل دیکھو پانچ بچے جن کر بھی ہم آج بھی......، ہم اولاد کے لئے ترستے ہیں"۔

یکا یک دل کی مریضہ کا دل بھر آیا...... اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس کا دل تڑپنے اور کلیجہ سو سنے لگا......!! بچپن کے عشق و محبت کی مسرت بڑھاپے کی حسرت و غم میں جو متبدل ہوتی ہو، تو یاس بھری آنکھوں میں آنسو اُبھرنے لگے اور یہ آنسو اس کے بدنصیب دامن کو تر کرنے کے لئے پلکوں پر لرزنے لگے۔

بیوی کی حالت دیکھ کر بوڑھا سخت پریشان ہوا اور تشفی آمیز لہجے میں بولا......

"فاطمہ! یہ تم کیا کر رہی ہو، تمہارے لئے کسی بات پر پچھتانا ٹھیک نہیں...... جب تک میں زندہ ہوں۔ تجھے کوئی پرواہ نہیں۔ میرے جیتے جی تو ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کر...... تو جانتی نہیں یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ یہاں کسی پر بھروسہ نہیں۔ چاہے وہ اولاد ہی کیوں نہ ہو"

بوڑھی شکایت آمیز لہجے میں بولی "اچھا تو جب رشید کو یہ کہنے گئے تھے، تیری ماں بیمار ہے۔ اور وہ ہسپتال میں داخل ہو رہی ہے۔ تو اس نے کیا کہا تمہیں جب کہ وہ......!"

بوڑھے نے ایک ٹھنڈی آہ بھری...... بیٹے کا جواب اس کے جسم کے ریشے ریشے میں ایک طوفان کی کیفیت سی سرائیت کر گئی۔ اگر چہ مریض بیوی کے سنمکھ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپانے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن وہ اس میں اتنا کامیاب نہ ہو سکا جتنا کہ اسے توقع تھی۔ اس کی اس حالت نے فاطمہ کو مشتبہ دلگیر اور پریشان سا کر دیا۔

وہ گھمبیر آواز میں بولی۔

''کہ...... کیا بات ہے۔ تم صاف صاف کیوں نہیں بتاتے، میں کیا......؟''

بوڑھا نہ جانے کن خیالوں میں اُلجھ کر خلاء کو تک رہا تھا۔

دق کی مریضہ کو تپی کا خاموش اضطراب اور جوان بیٹے کی یاد جدائی برچھی سی بن کر سینے کے پار ہوگئی۔ جس برچھی نے اس کے جگر کو بر ما دیا۔ اور دل کو کرید ڈالا...... اس کا سر چکرانے لگا، بدن...... اور بدن کا انگ انگ تھرتھرانے لگا۔

دق کی مریضہ تھی۔ اس لئے تاب نہ لا کر...... گر گئی۔

وارڈ نمبر ۴ میں جب اس نے بیڈ پر آنکھیں کھولدیں تو اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ کوئی خواب دیکھ کر جاگی تھی۔ اس کے آنکھیں کھولتے ہی بوڑھے نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے لرزتے ہاتھ کو اس کے ماتھے پر رکھ کر پوچھا ''کیا حال ہے فاطمہ؟!'' بوڑھی نے سلطان کے چہرے کو بھرپور نظر سے دیکھا اس نظر میں جو حسرت کا پہلو جھلکتا تھا وہ بوڑھے کو کہہ رہا تھا۔

''اپنا حال کیا بتاؤں، تم جو دیکھ رہے ہو''۔

بوڑھے نے جونہی اس کے ماتھے پر سے ہاتھ اُٹھانا چاہا، تو بوڑھی نے فوراً اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھدیا اور کہا ''رشید تو نہیں آیا ہے؟''

شائد آجائے گا'' اس نے پریشان انداز میں جواب دیا'...... یہ دیکھو میری آنکھ دُکھتی ہے...... بشارت ہی ہے''۔

''تم اس کو بلا کیوں نہیں لاتے؟!'' اس کی آواز میں التجا تھی۔ یہ التجا نشتر بن کر اس کے دل کو......، جس کی تاب نہ لا سکا اور وہ وہاں سے چلدیا......، چلتے بڑھتے اس کے لڑکھڑاتے قدم اس کی اندرونی حالت کی غمازی کر رہا ہے۔ وہ ایکدم رُک گیا۔ ساکن وصامت کھڑا ہو گیا معاً اسے بیٹے کے نام خط لکھنے کی سوجھی تا کہ وہ بیٹے کو بلا لائے اور آرزومند ماں اسکا درشن کر سکے۔ اس خیال سے بوڑھے کو قدرے ڈھارس ہوئی اور یہی

ڈھارس اس کے لئے بیٹے کے نام خط لکھوانے کی ترغیب بنی۔ ویسے اگر دق کی مرضہ کے اصرار والتجا کا خیال اس کے ذہن پر مرتسم نہ ہوتا، تو شاید ہی وہ رشید کی آمد کے خیال کو پاس بھٹکنے دیتا۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی فاطمہ کی طرح بیٹے کو اپنے قریب دیکھنے کی آرزو اسکے ذہن کے گوشے میں کہیں خوابیدہ تھی۔ بعض اوقات تو وہ بھاگ کر رشید کے ہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر......، جو رکاوٹ سامنے حائل ہو جاتی تھی اس کے تحت وہ پشیمان ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔

جس طرح وقت شام کی آمد کی خبر دے کر دن بھر کی درخشندگی کو خیر باد کہہ رہا تھا۔ اسی طرح بوڑھے کی آنکھوں کی بینائی اسے بے وفائی کر رہی تھی۔ بازار سے خطہ لے کر جب وہ ہسپتال کے گیٹ سے اندر آیا......اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تو دوسری کے بعد تیسری سیڑھی چڑھتے ہی اسے ٹھوکر لگی۔

قریب تھا کہ وہ گر جاتا ایک نوجوان نے پیچھے سے آ کر اسے پکڑ لیا اور سیدھا کھڑا کر کے پہلے اسے سرتاپا بغور دیکھا اور پھر سہارا دے کر اُوپر لے آیا۔

''بابو جی! میں آپ کا نہایت ہی مشکور ہوں''۔ اس نے سادگی سے کہا'' آپ نے مجھ بیکس کو سہارا دیا۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے''۔

بوڑھے کی زبانی ''بابو جی'' کا لفظ سنکر نوجوان خود کا اس انداز سے جائیزہ لینے لگا۔ گویا کہ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ کیا میں واقعی بابو جی ہوں؟ کہیں یہ ان کا طنز تو نہیں ہے۔

وہ بادامی رنگ کا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں پر عینک لگی تھی۔ اور ہاتھ میں ہینڈ بیگ۔

اوپر لان میں پہنچ کر بوڑھا تھوڑی دیر دم سنبھالنے بیٹھ گیا۔ جونہی اس نے ''بابو جی'' کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کرنا چاہا۔ اسے خط لکھوانے کا خیال آیا۔ اور وہ انکساری سے اس کی طرف بولا'' بابو جی! اگر فرصت ہو تو......تو میرے لئے ایک خط لکھ کے

دے دیجئے...... میرے بیٹے کے نام"۔

اس کے انکسار نے نوجوان کے لئے کسی عذر کی گنجائش نہ چھوڑی اور وہ خاموشی سے خط لکھنے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی رہی پھر "بابو جی" قدرے ہچکچاتے ہوئے بولا کیا لکھنا ہے خط میں؟"

بوڑھا چونک سا گیا اور بولا "خط میں لکھنا ہے......" یہ کہہ کر بوڑھا خاموش ہوا اور جیب سے انلینڈ خط نکال کر بابو جی کے ہاتھ میں دے کر بولا "لکھئے......نور چشم......"

"نہیں!" اس نے گویا تعرض کرتے ہوئے کہا "تم پہلے مجھے وہ سب کچھ بتاؤ جو تمہیں خط میں لکھنا ہے۔ پھر وہ سب باتیں میں ترتیب کے ساتھ خط میں لکھ دونگا...... سمجھئے؟"

بوڑھا وقفہ بھر خاموش رہا اور کچھ سوچ کر متاسفانہ انداز میں بولا "دیکھو بیٹا......! خط اس طرح لکھنا......، میرے پیارے بیٹے! غالباً ساٹھ برس بعد آج میں اور تیری ماں اُس مقام پر لوٹ آئے ہیں۔ جہاں پر ہم نے اپنی حیات اور زندگی پر بہار کا رنگین و دلفریب زمانہ گزارا تھا...... یہ وہ زمانہ تھا جب اس دنیا میں تیرا وجود ہی نہ تھا۔ مگر......" کہتے ہوئے اس کی آواز بھر آئی اور وہ خلا کی طرف اپنی نگاہیں دوڑا کر کچھ سوچنے لگا......سوچتے سوچتے شاید وہ ماضی کی یاد میں کھو جاتا کہ نوجوان نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا "اچھا اب آگے بتایئے"۔

"بوڑھا چونک سا گیا اور بولا "لکھدو...... کیا کہہ رہا تھا میں؟"

تم نے کہا، یہ وہ زمانہ تھا جب اس دنیا میں تیرا وجود ہی نہ تھا۔ مگر...... مگر اس وقت بھی ہمارے دلوں میں تمہاری تمنا موجزن تھی" بوڑھے نے معصوم مگر بوجھل آواز میں کہا۔

"آج تمہارے والدین کی نگاہیں یہاں کے اس ماحول میں اُسی ماضی کو ڈھونڈ

رہی ہیں۔ جس میں ہمیں اولاد کی تمنائیں دن کا چین اور رات کا آرام حرام کئے ہوئے تھا۔ خدا نے ہمیں وقت بر وقت اولادوں سے نوازا تو تھا۔ مگر ان کا داغِ مفارقت دینا آج بھی ناسور بن کر ہمارے دلوں کو گھایل بنا رہا ہے۔ اس ناسور کے صرف تم ہی مرہم تھے۔ مگر تم نے ہمارے ناسور بھرے دلوں کو ہر دم تڑپایا اور ہم سے جُدا رہتے ہوئے جدائی کے نشتر سے ہمارے صابر کلیجوں کو کریدا۔

اس کے باوجود بھی ہم تجھے یاد کرتے ہیں۔

ویسے ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے۔ آج کل کی مصروف زندگی میں کسی کے لئے وقت نکالنا خزانہ پر سے شاہمار کو ہٹانے کے برابر ہے۔ خاص کر ایسے وقت میں جب نیا جوڑا، نیا گھر بنا رہا ہو۔ تمہاری والدہ اگرچہ دق کی مریضہ ہو کر ہسپتال میں پڑی......اپنی زندگی کے آخری ایام......نہیں نہیں!!"

بوڑھے نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور اسی طرح ہاتھوں سمیت ماتھے کو گھٹنوں پر رگڑنے لگا۔ بوڑھے کی حالت دیکھ کر نوجوان "بابو جی" مضمحل، پریشان، اُداس اور نہ جانے کیا کیا ہوا۔ اس وقت اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا۔ جیسا کہ وہ انگاروں پر بیٹھا تھا اور بغیر کچھ کہے سُنے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اور پھر............

اتنے میں بوڑھے نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھ لئے اور دبی آواز میں کہا" معاف کرنا، میری خاطر تمہیں دیر ہو رہی ہے......، اچھا تو کیا کہہ رہا تھا میں؟!"

"......اور اپنی زندگی کے آخری ایام......"

"ہاں! اگرچہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام پورے کر رہی ہے۔ پھر بھی اسے تمہیں دیکھنے کی ایسی ہی چاہت ہے۔ جیسی موسیٰؑ کو کوہِ طور پر خدا کے جلوے کی چاہت تھی اور ایک مریض ماں اپنے خدا کا درشن ہسپتال میں کرنے کی آرزومند ہے۔ اور اگر تم نے ماں کی تمنا کی لاج رکھدی تو......تو میں......" وہ ایک دم خاموش ہوا۔ اس کے چہرے پر

مایوسی کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی۔ جو اس کے چند یوم پہلے واقعہ کی غمازی کرنے لگی۔

وہ اس انداز سے خاموش ہوا، جیسا کہ اب وہ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اس کے خاموش گھمبیر چہرے سے جو مایوسی اور پریشانی تھی۔ وہ اس کے ماضی کو اُجاگر، حال کو آشکار اور مستقبل کی تشہیر کر رہی تھی مگر وہ ماضی حال اور مستقبل سے بے خبر نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ یکا یک اس نے گردن اٹھائی اور ایک مخصوص سمت کی طرف دیکھ کر بولا''......اچھا کیا کہہ رہا تھا میں؟''

''......اور اگر تم نے ماں کی تمنا کی لاج رکھی تو میں......''

''ہاں جب تم یہاں ماں کے درشن کے لئے آؤ گے تو تمہارے ساتھ اگر دفتر کا کوئی آدمی ساتھ ہوگا تو......تو میں......'' بوڑھا پھر خاموش ہوا۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ فق سا ہوا۔ پھر اس پر سکتہ سا طاری ہوا۔ اب کی بار اس کی ہونٹ لرزنے لگے۔

لرزتے ہونٹوں نے پلکوں کو ڈھانپ لیا......آنسو کی دو بوندیں اس کے دامن پر ایسی پڑیں گویا زندگی کے دو ساتھی ایک منزل سے نکل کر دوسری منزل پر جا پہنچے۔

بوڑھے کی اس حالت پر نوجوان پچھتا رہا تھا کہ......، اتنے میں بوڑھے نے جھٹ اس انداز سے آنکھیں کھولدیں گویا وہ کوئی سپنا دیکھ کر جاگ اُٹھا تھا۔ اس کے بدن میں جھر جھری سی آئی اور کرخت لہجے میں بولا۔

''کیا کہہ رہا تھا میں......؟!''

نوجوان نے پہلے زبان سے ہونٹوں کو تر کیا، پھر بولا۔

''دفتر کا کوئی آدمی ساتھ ہوگا تو......تو میں......''

''تو میں کہیں چھپ جاؤں گا۔ تا کہ......'' بوڑھا خاموش ہوا اور گردن جھکائے آہیں بھرنے لگا۔

نوجوان ''بابو جی'' اس سے بار بار کچھ کہنا پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر ہر بار وہ ٹال دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ بوڑھے نے اس کے اضطراب کو محسوس کیا اور

خفیف سامنہ بنا کر بولا'' دیکھو بیٹا! آپ سوچتے ہونگے۔ میں یہاں کس بلا میں پھنس گیا

ہوں مجھے آپ کے وقت کا ضرور احساس ہے۔ مگر......، دراصل یہ میرا نہیں۔ بلکہ میرے بڑھاپے کا قصور ہے''۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور بولا۔

'' دیکھو بیٹا! اس ترقی یافتہ دِور میں......، یہ خط میں نہیں لکھتا۔ یہ میں تجھے کہہ رہا ہوں، ویسے میں جانتا ہوں پرانے بوڑھوں کی نصیحت کو اس صدی کے نوجوان بھینس کے آگے بین جان رہے ہیں......، اس تعلیم یافتہ دور میں اکثر لوگ آزاد خیال ہیں...... ہیں نا؟'' مگر وہ اس آزاد خیالی کا ناجائیز فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ میں آپ کے سامنے بیٹے کے خط کا مضمون صاف صاف لفظوں میں کہنے سے کیوں ہچکچاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ دفتری نوجوان ہے۔ میں اَن پڑھ یعنی جاہل ہوں...... میں نے جہالت کی مصیبتیں جھیلیں، دکھ اُٹھائے مگر اس کی تعلیم اور اس تعلیم کے ساتھ کتابوں اور پوشاک وغیرہ کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی......، یہ تو ہمارا فرض ہی تھا۔ اس لئے اس فرض سے کوتاہی برتنا ہم نے ایک پاپ سمجھ رکھا تھا...... آج وہ ایک دفتری آدمی ہے۔ آج اسے اپنی عزت کا احساس ہے'' بوڑھے کی آواز بھر آئی اور وہ بوجھل آواز میں بولا۔ آج کے تعلیم یافتہ نوجوان، قلاش ان پڑھ والدین سے اسی طرح دور رہتے ہیں جس طرح آج کل بعض مذہب پرست ایمانداری سے......، میں بھی کسی کا بیٹا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب میرے والدین حیات تھے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ عورت کے محبت نے مجھے اُن سے جدا کیا......، کیا کہوں ایسا زمانہ تھا کہ اگر کوئی پوچھ لیتا۔ تمہارا باپ کون ہے تو ہم فخر سے اپنے اپنا اصلی باپ دکھاتے تھے''۔

'' اصل سے تمہاری کیا مراد ہے'' بابوجی نے زنجیدگی سے پوچھا۔

'' مراد......، مراد تو بس یہ ہے کہ اُس سادگی کے زمانے میں اگر کسی کا باپ بوڑھا ہو جاتا تھا۔ تو وہ بزرگ کہلاتا تھا۔ مگر آج......، آج کل کے تعلیم یافتہ فیشن پرست نوجوانوں کے سامنے بوڑھے بزرگ نہیں بلکہ بوجھ کہلاتے ہیں۔ اب اگر بوڑھا ذلیل

ہو، اور چاہے وہ اولاد کی طفیل سے ہی ذلیل کیوں نہ ہوا ہو۔ تو وہ گھر کا مالک نہیں بلکہ نوکر کہلاتا ہے...... سمجھے؟''

''کہ...... کیسے؟!'' اس نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔

''ہاں اس صورت میں......؟'' اس کی پوری بات حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر بھی ایک طویل لمحے کے بعد متاسفانہ انداز میں بولا'' مجھے ایسا کہنے کے لئے رشید نے مجبور کیا بابو جی......''

''میں کچھ نہیں سمجھا؟''

''دیکھو بابو جی!'' اس نے گھمبیر آواز سے کہا'' دراصل بات یہ ہے کہ جب میں اسے یہ کہنے کے لئے اس کے دفتر گیا کہ تیری ماں سخت بیمار ہے۔ اور وہ ہسپتال میں انڈور ہو رہی ہے...... خدانخواستہ اگر وہ ہسپتال ہی میں...... تو اس کی آتما تمہیں کیا کہے گی، کیا کہے گی بتاؤ......؟''

''اس نے کیا کہا؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''بابو جی! اُس نے مجھے تسلی دی مگر...... اس کے چہرے کی رنگت سے میں نے اچھی طرح اخذ کر لیا اسے میرا یہاں اس طرح اور اس حال میں آنا اُسے شاق گزرا ہے......، یہاں سے نکل کر جب میں برآمدے کی سیڑھیاں اُترنے لگا کہ میرے کانوں میں ایک ایسی کربناک آواز آئی جس نے......

''کیا آواز تھی وہ......؟'' اس نے قطع کلام کیا۔

''وہ آواز تھی...... ہاں! رشید سے کوئی پوچھ رہا تھا۔ یہ کون آیا تھا؟''

''رشید نے کیا جواب دیا؟''

''اُس نے کہا......

دیکھو بابو جی! اُس نے......'' بوڑھے کی آواز بھر آئی اور وہ گلوگیر آواز میں بولا......''

اس نے فخر سے جواب دیا۔ یہ......، یہ ہمارے گھر کا نوکر ہے''۔ کہہ کر بوڑھا خاموش

ہوااور پریشان انداز میں بولا'' دیکھ لیا بیٹا! آج کل کے فیشن پرست تعلیم یافتہ نوجوان......، معاف کرنا بابو.جی! میری زبان سے ''بیٹا'' سن کر کہیں آپ کی بھی ہتک تو نہیں ہوئی کیونکہ میں......میں ذلیل آدمی ہوں''۔

''نہیں......! نوجوان'' بابو.جی'' گلوگیر آواز میں بولا۔ اس وقت اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ لرزتے ہونٹوں سے وہ بولا'' مجھ...... مجھے معاف کردو......؟!'' ابو مجھے معاف کردو!

بوڑھے کی گردن یک لخت بابو.جی کی طرف اُٹھ گئی۔ اوراس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں مریض بیوی کی آواز گونجی۔

''میں نے کہا تھا نا، میری آنکھ دُکھتی ہے''۔

''میری بھی آنکھ دکھتی تھی......'' اس نے زور سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہا۔ مگر اس طرح اس کی کمزور بینائی والی آنکھوں میں بینائی تیز ہونے کے بجائے کچھ تاریکی ہی چھا گئی۔

''مجھے معاف کرو......!'' اس کے کانوں میں یہ ایک خاص لوچ دار آواز کتنے عرصے کے بعد آئی اوراس آواز سے دفعتاً شفقت پدری عود کر آئی......وہ بے تحاشاہ اُٹھ کھڑا ہوااور دیوانہ وار آگے بڑھا......آگے بڑھ کر جونہی اسے بھینچنے کے لئے اس نے دونوں بازو پھیلائے تو وہ سر سے پیر تک ایسا کانپنے لگا گویا ایک باپ بیٹے سے نہیں بلکہ ایک نوکر اپنے آقا سے گلے ملنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔

❁❁❁

دیا جلاؤ......روشنی بجھاؤ

''خاموش!''

وہ زخمی جانور کی طرح غرایا

''میں خاموش نہیں رہوں گی؟''

اس نے ہزیمت خوردہ شکاری کی طرح وار کیا

''میں تم کو جان سے ختم کروں گا''

''تم ایسا نہیں کر سکتے؟''

''کیوں نہیں کر سکتا؟''

''تمہارے ایسا کرنے سے حقیقت چھپ نہیں سکتی؟''

میں کچھ سننا نہیں چاہتا؟!''

''غلط! تم سننا چاہتے ہو۔ اُس کے وہاں جانے کی یہی تو ایک شرط تھی''۔

''کس کی شرط تھی......؟''

''میری......!''

ایک زناٹے وار طمانچہ

......وہ گال سہلانے لگی۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

دونوں کے دیکھنے کا انداز جدا جدا تھا۔

مرد کی آنکھوں میں آگ

عورت کی آنکھوں میں پانی

آگ اور پانی کی بھاپ

اسی بھاپ سے دونوں جھلس رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو کاٹ کھائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ چند منٹ پیشتر دونوں

دونوں ابدی خوشی میں تحلیل ہو کر ایک دوسرے کو بانہوں میں لئے جھوم رہے تھے۔ اور جھومتے جھومتے دونوں بستر میں آ گئے تھے۔

ان کا آپس میں میاں بیوی کا رشتہ نہیں تھا۔ صرف عارضی ملاپ تھا...... دونوں ایک دوسرے کے عارضی پڑوسی تھے۔ ان کی آپس کی ان گناہ آلود خوشیوں کے لئے جو رول اس کی بیوی نے ادا کیا وہ......

"تم نے مجھے طمانچہ کیوں مارا!"

میں کچھ نہیں جانتا؟"

"اگر تمہاری بیوی کے چہرے پر اس وقت میرا شوہر اسی طرح اسی بات پر ایسا ہی ایک زوردار طمانچہ مارے تو......؟"

وہ چونک سا گیا...... اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔

یکا یک اس کے سارے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔

اس کی حالت سے ایسا لگتا کہ اگر اس وقت اس کے سامنے اس کی بیوی ہوتی تو وہ ضرور اس کو شوٹ کر دیتا، حالانکہ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ بھی کسی کی بیوی ہے جو میرے سامنے کھڑی میرے ہاتھوں پٹی جا رہی ہے، ہو نہ ہو میری بیوی بھی اس وقت اس کے شوہر سے ایسا ہی طمانچہ کھا کر اپنے گال سہلا رہی ہو......، یہ شرط کا تقاضا ہے۔ لیکن میں اس جھانسے میں کیوں آ گیا؟ مجھے یہ کیا ہو گیا......؟ آج یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا کر رہا ہوں۔ اور کیا کچھ سُن رہا ہوں۔

اگر میری بیوی کی اس وقت اس کے شوہر کے سامنے ایسی ہی حالت ہو گی جو اس کی بیوی کی میرے سامنے ہے تو مجھے ایک ایک کر کے سبھوں کو شوٹ کر دینا چاہیے اور خود

مجھے کسی اونچائی پر جا کر اپنے آپ کو گرا کر خودکشی کرنی چاہئے اب میرا جینا کسی کام کا نہیں......آج میں لٹ گیا۔ اپنے ہی ہاتھوں برباد ہو گیا"۔

یکا یک اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور اس انداز سے اپنے آپ کو بستر پر گرا لیا گویا آج اس کے سامنے سب کچھ گر گیا۔ بلندیاں پستی میں آ گئیں۔

تہذیب، اخلاق اور شرافت دب گئی۔

عزت، نام اور ناموس مٹ گیا۔

اور یہ سب اُسی کے ہاتھوں ہوا جو......، بیوی کی یاد آتے ہی وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھا لیکن دوسرے لمحے رُک گیا۔

وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑایا۔

اس نے بڑی بے صبری سے ادھر ادھر دیکھا۔

حسینہ دروازہ کے پاس کھڑی یہاں سے چلے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

رفیق نے اس کو کاٹ کھائی نظروں سے دیکھا۔ لیکن جلد ہی منہ پھیر کر اپنے آپ سے بولا۔

"ہو سکتا ہے دوسری طرف بھی ایسی ہی آگ لگی ہو، اور اس کا شوہر بھی میری طرح اسی آگ میں جھلس رہا ہو، اور اگر یہ صحیح ہے تو......" تو مجھے اسکے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہئے۔ مجھے......نہیں نہیں!! یہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ مجھے یہ کیا ہو گیا؟ میں کیوں اس جھانسے میں آ گیا؟ میرے ساتھ کیوں یہ کھیل کھیلا گیا......؟؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟

"کشمیر میں سردیاں شروع ہوتے ہی جب معمول کے مطابق یہاں کے سرکاری دفاتر جموں کی طرف چھ مہینوں کے لئے کوچ کر گئے، تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا آج زندگی میں پہلی بار دور کسی ویرانے میں مجھے گرفتار کر کے لیا جا رہا ہے۔ نومبر سے اپریل تک کا یہ عرصہ جموں میں گذارنے کا ویسے میرا یہ پہلا موقعہ نہ تھا۔ میں تو متواتر آٹھ سال سے جب سے میں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ہر سال سردیوں میں اپنے سرکاری

دفتر کے ساتھ جموں جایا کرتا تھا۔ ان اٹھ برسوں میں آج پہلی بار میں دربار موکوکوس رہا تھا۔ اور جموں جانے سے صاف کتراتا تھا۔ حالانکہ کشمیر کی آنے والی سردیوں کا خیال آتے ہی میں ابھی سے ٹھٹھرنے لگتا، کشمیری باشندہ ہوتے ہوئے بھی مجھے کشمیر کی سردیوں سے ایسا ڈر لگتا ہے کہ کچھ نہ پوچھو، اس ڈر کے مارے نومبر آتے ہی میں دربار مو کے دن گننے لگتا کہ کب اور کس گھڑی ہمیں اپنے اپنے دفتر کے ہمراہ جموں جانے کا آرڈر ملے تاکہ یہاں کی جان لیوا سردیوں سے نجات ملے، لیکن اس بار میرا جموں جانے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا''۔

''میں بتادوں گی ایسا کیوں......؟''

''اس لئے کہ اکتوبر کے مہینے میں میری تمہارے ساتھ شادی ہوئی تھی اور نومبر کے اختتام پر مجھے تم سے جدا ہونا تھا۔ جو میرے لئے سوہان روح سے کچھ کم نہ تھا۔ تم تو جانتی ہو کہ شادی سے پہلے میں نے تم کو شاید ہی دیکھا ہوگا۔ لیکن شادی ہونے کے فوراً بعد تم میرے جتنے قریب آگئیں مجھے ایسا لگا گویا ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ گویا ہم اکٹھے پلے بڑے ہیں۔ بہت کم وقت میں ہم ایک دوسرے کے جتنے نزدیک آگئے۔ شاید ہی کوئی میاں بیوی اتنے قریب آئے ہوں گے۔ میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی مل گئی۔ تم جیسا جیون ساتھی مل گیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں تمہارے بغیر میں ایک پل بھی جی نہیں سکوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں جموں آگیا تو چند دنوں میں میری جو حالت ہوئی وہ میں بیان بھی نہیں کرسکتا، بار بار تمہاری یاد آتی تھی، تمہاری باتیں، تمہاری آنکھیں اور تمہاری ادائیں، تمہاری قربت اور......

''تم نے اسی لئے گھر والوں کو لکھ دیا ہوگا کہ جموں میں کشمیری ملازموں کو بغیر فیملی کے آسانی سے رہائش کے لئے جگہ ہی نہیں ملتی ہے''۔

''یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن تمہارے لئے میں سخت بے چین تھا۔ نہ میرا دفتر میں جی لگتا تھا۔ نہ ہی ڈیرے پر، تم ہر وقت میرے وجود پر چھائی رہتی تھیں۔ تمہاری ایک

ایک بات یاد آ کر میں مچلنے لگتا۔

''کونسی باتیں......؟ میں بھی تو جانوں؟''

''کچھ باتیں ہوتیں تو بتا دیتا تمہاری تو ہر بات...... میں کبھی کبھار یہ بھی سوچتا ہوں کہ جو باتیں تم مجھے بتاتی ہو کیا سب بیویاں اپنے اپنے شوہر کو ایسی ہی باتیں بتاتی ہیں۔ ایسا ہی پیار دیتی ہیں۔ اگر واقعی سبھی بیویاں ایسا ہی کرتی ہیں تو مجھے ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ اگر نہیں تو مجھے اپنے آپ پر فخر کرنا چاہئے کہ مجھے تم جیسی بیوی مل گئی جس نے مجھے اپنا تن من دیا۔ جس نے زندگی گزارنے کا مجھے اچھا سلیقہ بتا دیا جس نے مجھے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کا طریقہ بتا دیا۔ جو قدم قدم پر میری رکھوائی کرتی ہے۔ میری ایک ایک چیز کا خیال رکھتی ہے۔ جو مجھے ہر وقت خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو میری صحت کے لئے مجھے بچوں کی طرح اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ہے۔ اور فالتو وقت میں مجھے سیر تفریح کو لے جاتی ہے اور رات کو میرے پہلو میں سو کر مجھے ابدی خوشی و مسرت میں ڈبو دیتی ہے......نصرت! تم کتنی اچھی ہو!''

''رفیق! جن باتوں سے تم خوش ہو کہ میں ایسا کرتی ہوں انہی باتوں سے مجھے مسرت ہے کہ یہ سب کچھ تم مجھے بتاتے اور سکھاتے ہو، اگر تم مجھ پر ناز کرتے ہو تو میں تم پر فخر کرتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ مجھے تم جیسا جیون ساتھی مل گیا جو میری ناز برداری کرتا ہے۔ میرے مشوروں پر چلتا ہے۔ جو مجھے ہر دم خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میری ہر آرزو پوری کرتا ہے۔ میری ہر چاہت پروان چڑھاتا ہے، میری ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ تمہاری دلچسپی اور تمہاری قربت دیکھ کر میں خوشیوں میں ڈوب جاتی ہوں......بھگوان کرے ہم دونوں ایسی خوشیوں میں ڈوبے رہیں۔ رفیق! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دو ساتھی ہیں۔ ہم زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں ہماری حیثیت برابر برابر کی ہے، ایک دوسرے کے بنا ہم نامکمل ہیں۔ ادھورے ہیں۔ تم مجھے اپناؤ، میں تم کو اپناؤنگی، تم مجھ کو پالو میں تم کو پالوں گی۔ تم میری ضرورت کو پورا کرو میں

تمہاری ضرورت کو پورا کروں گی۔ تم میری آرزو، چاہت اور تمنائیں پوری کرو، میں تمہاری تمنا ارزو اور چاہت کے لئے اپنی جان تک دے دوں گی۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گی۔"

"نصرت! یہ باتیں تم نے کتنی بار بتا دی ہیں......اور بار بار تمہاری زبان سے یہی باتیں سننے کے لئے میں یہاں مچلنے لگتا تھا۔ جب میں زیادہ دیر تک تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکا تو میں نے تمہیں یہاں بلا لایا۔ یہاں پر ہم نے ایک سیٹ کرایہ پر لیا جس کے آدھے حصے میں پہلے ہی ایک فیلی رہتی تھی۔ یہاں ہم نئے سرے سے زندگی گزارنے لگے۔ پہلے پہل میں صبح کھانا کھا کر دفتر جایا کرتا تھا۔ لیکن دفتر میں جب تمہاری یاد مجھے تڑپاتی تو میں نے دوپہر کو ڈیرے پر کھانا کھانے کے لئے آنا معمول بنایا۔ اس طرح ہم شام کی طرح دوپہر کو بھی ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ تم مجھے کھلاتی میں تم کو کھلاتا۔ اس طرح ہنسی خوشی ہم دن گزارتے رہے۔

تم کو یاد ہوگا۔ میں نے تم کو کتنی بار کہا تھا کہ تم پڑوسن کی طرح بن ٹھن کر کیوں نہیں رہتی ہو، یہ ٹھیک ہے کہ وہ سینئر کلرک کی بیوی ہے اور تم سٹونوگرافر کی، لیکن میری مرضی ہے کہ تم اس سے بڑھ چڑھ کر رہو، تم ہمیشہ اس کے حسن کو مات دینے کی کوشش کرو تا کہ میری نظر اس پر ٹھہر نہ جائے۔"

"کیا تمہاری نظر اس پر ٹھہر جاتی ہے؟"

"نصرت! میں تمہارے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ چاہیے وہ کیسی ہی تلخ بات کیوں نہ ہو، میں سچ کہہ رہا ہوں تمہاری اس پڑوسن......کیا نام ہے اسکا......؟"

"حسینہ......"

"بہت خوب......نام کی طرح اس کے حسن میں بھی بہت کشش ہے۔ جب بھی میری نظر اس پر پڑتی ہے تو یکا یک میری نظر اس پر ٹھہر جاتی ہے، میرا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ اور میرے منہ سے ایک آہ نکل جاتی ہے کہ کاش! تم بھی ایسی ہی ہوتی

حالانکہ حسن اور خوبصورتی میں تم کچھ کم نہیں مگر میں کیا کروں۔ تمہاری حسینہ نے نہ جانے مجھ پر کونسا جادو کیا ہے"۔

"اچھا تو یہ بات ہے؟ کیا تمہارے ساتھ اس کی بات چیت ہوئی ہے؟!"

"نہیں صرف مڈ بھیڑ ہوتی ہے پڑوسن کے ناطے"۔

"کیا وہ تمہارا مدعا سمجھتی ہے؟"

"میں کیا جانوں؟ البتہ جب میں اسے گھور گھور کر دیکھتا ہوں تو وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتی ہے۔ اور پھر ایک ادا سے اندر چلی جاتی ہے"

"رفیق! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میرا دل بہت دُکھ رہا ہے۔"

"نصرت! میں تمہارا دل دکھانے کے لئے ایسا ہرگز نہیں کہہ رہا ہوں لیکن سچی بات کہنے کے لئے میری زبان کسی کے سامنے نہیں رُکتی، ہوسکتا ہے یہ میری کمزوری ہو......!"

......"کیا تم میری ایک بات مانو گے؟"

......"کیا......؟"

......"ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم اور کسی جگہ رہنے کے لئے کوارٹر لیں گے۔"

"صرف ایک شرط پر؟"

"کونسی شرط؟"

"تم مجھے اس سے صرف ایک چانس دلاؤ، اس کے بعد میں تمہارے سامنے توبہ کروں گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارا تابعدار رہوں گا۔ تم جو کچھ بھی کہو گی میں مانوں گا......تم میری یہ ایک چاہت پوری کروگی تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے جیون بھر کا سکھ دیا۔ تم نے مجھے سب کچھ دیدیا......نصرت! پلیز میری یہ چاہت کسی طرح پوری کردو......، میں تمہارے پیر پڑتا ہوں"۔

''لیکن میں اس میں کیا کرسکتی ہوں؟!''

''تم اس کو میرے لئے راضی کرسکتی ہو، کیونکہ مجھے اس کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملتا تم دن بھر یہاں اس کے ساتھ رہتی ہو باتوں باتوں میں اس کو ٹٹولو اور پھر کسی طرح صرف ایک چانس کے لئے اسے پھنساؤ، چاہیے اس کے لئے تمہیں کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے''

''تمہاری اس چاہت کے لئے میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گی لیکن مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی بھی تم اس قسم کی چاہت کا اظہار نہیں کرو گے۔ اور نہ ہی کبھی کسی عورت کو نظر بد سے دیکھو گے''۔

''میں وعدہ کرتا ہوں''

''میں کوشش کروں گی!''

''اُف......! یہ سب کیا ہو گیا؟''

''کیا میں یہاں سے جاسکتی ہوں؟''

''ہاں حسینہ! تم جاسکتی ہو، لیکن ایک بات یاد رکھو تم نصرت کو میری طرف سے کہہ دینا وہ یہاں میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرے اب سے وہ مجھے اپنا منہ نہ دکھائے اگر وہ یہاں آگئی تو میں اسے ختم کردوں گا''۔

''اگر میرا شوہر بھی اس وقت تمہاری بیوی سے ایسا ہی کہتا ہو گا تو......؟''

''او'' ہاں!'' تو میں کیا کرسکتا ہوں......، ویسے اس کو بھی ایسا کہنا چاہیے''۔

''کیا اس لئے کہ آپ مردوں نے ہم عورتوں کو ایک کھلونا سمجھ رکھا ہے''۔

''نہیں ایسی بات نہیں''۔

''اگر تم حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ تو پھر تم نے نصرت کے سامنے ایسی چاہت کا اظہار کیوں کیا جس کی اُسے ایسی قیمت ادا کرنی پڑی''

''تم نے اُس کے سامنے ایسی شرط کیوں رکھدی اُسے بھی اپنی جان دینی تھی۔ لیکن اپنی عزت......

''تمہاری چاہت برلانے کے لئے میں اُس کی جان لے کر کیا کرتی کیونکہ مجھے بھی اپنے انور کی چاہت پورا کرنے کے لئے تمہاری نصرت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا......، غلطی میری ہے جو تمہارے سامنے میں نے اس بات کا اظہار کیا۔ حالانکہ میں اور حسینہ نے یہ مسئلہ اپنے آپ تک محدود رکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا''۔

کیا تمہارے انور نے تم سے کہا تھا کہ تم مجھے نصرت سے صرف ایک چانس دلاؤ میں ہمیشہ کے لئے تمہارا تابعدار رہوں گا''۔

''ہاں، میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ آئندہ وہ میرے سامنے ایسی کسی چاہت کا اظہار نہ کرے اور یہ چاہت پورا ہوتے ہی وہ اس کوارٹر کو چھوڑ دے''۔

''آف......! یہ میں کیا سن رہا ہوں......میں یہ کونسی سزا بھگت رہا ہوں۔ تم چلی جاؤ۔ یہاں سے......، تم نصرت کو فوراً یہاں بھیجدو، ہم یہ کوارٹر آج ہی خالی کردیں گے۔

میری جوانی، تیرا انعام

آج پورے پانچ بجے ہونے والا افتتاح۔

کتنے دنوں سے اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ افتتاح میں بس اب چند گھنٹے ہی تو باقی رہ گئے تھے...... آج مس کماوتی آرٹس کلب کا افتتاح کرنے والی ہے۔ کوئی سوا مہینہ ہو گیا۔ جب آرٹس کلب کا اعلان ریاستی اکیڈمی کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اعلان میں نہ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ہر اچھے آرٹ پر بالترتیب پانچ انعامات دیئے جائیں گے بلکہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ریاستی ثقافت کی وزیر مس کملاوتی کلب کا افتتاح کرینگی اور خود ہی بالترتیب پانچ انعامات ہر اچھے آرٹ کے نمونے پر عنائت کرینگی۔

ریاستی اکیڈیمی کے اس اعلان سے مقامی اور غیر مقامی آرٹسٹوں کے حوصلے واقعی بلند ہوئے تھے کیونکہ اپنی نوعیت کا نہ صرف یہ پہلا آرٹس کلب تھا بلکہ اس میں بھاری انعامات کے ساتھ آرٹ کا مقابلہ بھی تھا...... نئے آرٹسٹوں کو اُبھرنے کا ایک بہترین ذریعہ تھا۔

مس کماوتی کی آمد میں اب تھوڑی دیر باقی رہ گئی تھی۔ اس لئے سبھوں کی نگاہیں اُسی سمت لگی ہوئی تھیں جہاں سے وہ کروفر کے ساتھ آرہی تھیں۔ مقامی پولیس کا بینڈ خوش رنگ وردیوں میں ملبوس اپنے ماسٹر کے اشارے کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ادیب، شاعر خواص اور عوام جلسے کے سواگت میں سڑک کے دونوں جانب کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے افیسر اور تعلقدار اسامیاں کلب کے ایک سرے سے دوسرے سیرے تک برابر گشت لگائے پھر رہے تھے۔

ہال سے باہر کے چھوٹے سے کمرے جس کو ہم راہداری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس

میں وہ آرٹ کے نمونے اور پوٹریٹ رکھدئے گئے تھے جو اُن آرٹسٹوں کے پُرانے نمونے تھے جو تقسیم کے دوران اپنے آرٹ کو چھوڑ کر اُس پار چلدیئے تھے۔

اس آرٹ کو محض آرائش کے لئے رکھدیا گیا تھا۔ کیونکہ شرائط کے رو سے سرحد کے اُس پار والے آرٹسٹ اس میں شرکت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اور اسی وجہ سے باہر کا یہ آرٹ اندر کے آرٹ کو رشک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے آرٹ رشک کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اسے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ جس ملک کے تہذیب وتمدن اور ثقافت اور کلچر کی میں ترجمانی کر رہا ہوں ایک روز وہ ملک وہ قوم تقسیم ہو گی جس کے کارن میری قدر و قیمت گر جائے گی۔

اس آرٹ کو کبھی یہ خیال بھی نہیں ہوا تھا۔ کبھی میرا تخلیق کار شرائط کا پابند ہو جائے گا۔ اور وہ سرحد کے ''اُس پار'' والا کہلائے گا۔ اور میں...... ''مجھے اس سرحدی تنازعے کی صلہ میں ہال سے راہداری میں جگہ ملے گی۔

یکایک ایک شور سا بلند ہوا۔ مس کملاوتی کی کار آہستہ آہستہ کلب کی جانب آرہی تھی۔ اس کے پیچھے چند کاریں اور جیپیں بھی تھیں۔ جن میں چھوٹے بڑے آفیسروں اور کچھ مہمان تھے۔

جونہی مس کملاوتی کار سے اُتریں تو بینڈ نے اُسے سلامی دی۔ اور اس کے بعد وہ اکڑ اکڑ کر کچھ اس طریقے سے چلدیں گویا وہ خاندانی وزیر تھیں۔ اس وقت اس کے قدم جو کلب کی جانب اُٹھ رہے تھے۔ اُس کی اندرونی حالت کی پوری غمازی کر رہے تھے۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا جلسہ تھا جس میں انہیں ایک صدر کی حیثیت حاصل ہوئی تھی۔ اُس کی گردن نہ زیادہ جھکی ہوئی تھی نہ زیادہ بلند تھی۔ اُس کے چہرے کی رنگت اور اُتار چڑھاؤ سے اس وقت ایسا ظہار ہو رہا تھا جیسے اُس کی جوانی کے وہ سپنے جو عام طور پر جوانی میں دیکھے جاتے ہیں آج تعبیر کے روپ میں پورے ہو رہے تھے۔ اس وقت اس کے جسم کے انگ انگ سے خوشی و مسرت پھوٹ رہی تھی۔

ایک کے بعد ایک سیڑھی چڑھ کر جب وہ راہداری میں آئیں تو سب سے پہلے اُس کی نظر ہال میں جانے والے دروازے کے اوپر لگے ہوئے پوٹریٹ پر پڑی۔

یکا یک اُس کی نظر جم گئی۔ اس کے جسم میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی۔ یکا یک اُس کی چال ڈھال اور اُس کی رنگ میں نمایاں فرق آ گیا۔

آرٹ کے اس پُرانے نمونے نے اس پوٹریٹ نے اس کی ساری خوشی و مسرت ایسی نچوڑ لی کہ اس کے ہوش و حواس ہی منجمد ہو گئے۔ وہ اس آرٹ کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ساکن و سامت برابر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس کے اندر ایک ہیجان سا بپا ہو رہا تھا۔ اس کا دل جو پنچم سر میں دھڑک رہا تھا۔ اب ایک عجیب کیفیت میں دھک دھک کرنے لگا۔ وہ نظریں بچا کر ٹانگوں میں سکت لا کر آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن کامیابی اُس کے سامنے سلب ہو رہی تھی۔

اس آرٹ کو بغور دیکھتے رہنے سے وہ اپنے آپ کو بھول گئی۔ اپنے گرد و پیش، اس ماحول اور پھر اس جلسے کو بھی بھول گئی۔ سب کے سب اس کی اس حالت و حرکت پر حیران ہو رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی اسے جھنجھوڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور خود وہ...... اس وقت تو وہ پتھر کی مورتی جیسی بے حس و حرکت کھڑی مشتاق اس پوٹریٹ کو دیکھ رہی تھی۔

پرانے آرٹ کے اس نمونے میں دور ایک بلند پہاڑ کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اوپر نیلے آسمان پر سفید ابر کے کچھ ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع میدان نظر آ رہا تھا اور اس میدان کے سامنے ہرے بھرے شاداب کھیت اور ان کھیت کے ارد گرد چھوٹے بڑے درخت پھولوں اور پھلوں سے لدے نظر آ رہے تھے۔ اس کے ایک جانب ایک ندی دکھائی دے رہی تھی جس کا پانی تھرک تھرک کر بہہ رہا تھا۔ ندی کے کنارے ایک دوشیزہ بیٹھی اپنی خمار آلود نگاہیں پیلا کر کچھ اس طرح سے دیکھ رہی تھیں گویا وہ جوانی کی بہار کی متلاشی تھی۔ اس آرٹ پر برے بڑے حرفوں میں لکھا تھا...... جوانی کی بہار۔ اور نیچے ایک کونے پر درج تھا عمل! مسعود شوقین۔

وہ "جوانی کی بہار" کو بغور دیکھ رہی تھی اور من ہی من میں اس تصویر سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ ندی کے کنارے بیٹھی دوشیزہ اُسے فلمی ہیروئن کی طرح پردۂ سیمیں پر ناچتی باتیں کرتے دکھائی دے رہی تھی۔

اس تصویر میں اُسے ایک نوجوان بھی اُبھرنا نظر آرہا تھا جانا پہچانا نوجان...... مسعود شوقین۔

جس مسعود شوقین کے وجود کو مدنظر رکھ کر کبھی وہ فخر سے کہا کرتی تھی...... میں آرٹ کی شوقین ہوں۔ شوقین کہتے ہوئے شرما بھی جاتی تھی۔ اس لئے دوسروں کے سامنے یہ شوقین کے بجائے دلدادہ بھی استعمال کرتی تھی۔ البتہ جب اس کا شوق پختہ ہوگیا تو اُس نے دلدادہ پر شوقین ہی کو ترجیح دی۔ رفتہ رفتہ آرٹ کی شوقین کے بعد یہ مسعود کی شوقین ہوکر بھی چمکی۔

وہ برابر اس تصویر کو تک رہی تھی کہ یکا یک اس کے ذہن میں ایک آواز سی گونجی۔

"تصویر تو مکمل ہوئی، اب لاؤ نا میرا انعام......؟"

وہ اس تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی اور آواز پہچان رہی تھی۔

"کملا......! تمہیں وہ سُہانی صبح یاد ہے؟ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ قدرتی آرٹ کے اس اپنے کشمیر کو کیسے بھول سکتا ہوں'۔ میں اُس ساعت کو بھی نہیں بھول سکتا جس نے۔ میرے آرٹ میں ایک جلا بخشی۔" یہ تم کو بھی معلوم ہے۔ پھر میں اُسے کیسے بھول جاؤنگا کملا......!

میں جھیل کے کنارے بنڈ پر بیٹھا تھا اور تاحدِ نظر اُس جنت الارض وادی کو دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اُس کا ماڈل بنا رہا تھا۔ نیلی جھیل کے اس بنڈ پر چار چبوتری سے لیکر قلعہ ہاری پربت تک، شنکراچاریہ پہاڑی سے لے کر ڈل گیٹ تک کا ماڈل تیار کر چکا تھا۔ اور اب میں اس میں رنگ بھر رہا تھا۔

میں اپنے آرٹ میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے گردوپیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ میرا ہاتھ بہت تیز

چل رہا تھا۔اچانک میں نے بُرش کی ڈنڈی دانتوں تلے دبائی۔ کیونکہ مجھے آپ ہی آپ ایک غلطی کا احساس ہو چلا تھا لیکن اپنی تصدیق کے لئے جب میں نے دائیں جانب اپنی نگاہیں دوڑائیں تو وہاں پر واقعی دونو جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جن کا ماڈل آپ ہی آپ میرے قرطاس پر کھینچ ااایا تھا۔اُن دونوں میں سے ایک تم تھیں اور دوسری تمہاری سہیلی تھی۔

میں نے تم دونوں کو پہچان لیا تھا...... تمہاری طرف سے نظریں اٹھانے کے بعد جب میں اپنے آرٹ پر توجہ مرکوز کر رہا تھا تو تم آپس میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگتی تھیں۔تم کو شک ہو چلا تھا کہ یہ ہماری تصویر کھینچ رہا ہے۔اور ساتھ ساتھ ہمارا اور اس تصویر کا موازانہ کر رہا ہے۔تم کو یاد ہوگا۔اُن دنوں تم ایف اے میں پڑھتی تھیں۔ میں آپنے آرٹ میں کھونے کے باوجود بھی دیکھ رہا تھا۔تم میرے پاس آنا چاہتی تھیں۔ اگر تم اُس وقت اکیلی ہوتی تو تم ضرور میرے پاس آتیں۔اپنے علاقے میں بھی تم نے کتنی بار میرے پاس آنے کی کوشش کی تھی۔ویسے جب اتوار کے روز میں نشاط باغ کے آخری طبقے پر بیٹھا منظر کشی کر رہا تھا۔تو تم سب لڑکیوں سے چھوٹ کر میرے پاس آئی تھیں اور میرے سامنے سے آتے جاتے دو تین گشت لگا کر جب تم میرے قریب ٹھہر گئی تھیں تو تم نے مجھ سے جھجکتے شرماتے پوچھا تھا۔

''اس روز آپ نے وہ تصویر بنائی تھی؟''

پہلے میں نے تمہیں بغور دیکھا اور پھر کہا تھا''افسوس وہ تصویر مکمل نہ ہو سکی''۔

اس وقت تم نے میرے اس افسوس کی خاص کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ گویا تم اچھی طرح جانتی تھیں۔اگر آرٹسٹ کی ہر تصویر مکمل ہوتی تو اُس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

تم نے مجھے بتا دیا تھا۔میں آرٹ کی بہت شوقین ہوں۔اور میں زیرلب مسکرا دیا تھا۔

''آپ مسکراتے کیوں ہیں؟۔تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''اس لئے کہ تم آرٹ کی شوقین ہو اور میں...... میں مسعود شوقین ہوں''۔ میں

نے بتا دیا تھا۔ اور میں نے دیکھا لیا اس وقت تمہاری گردن ذرا جھک گئی تھی۔

اگلے روز میں ہارون میں بہتے پانی کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ نالے کی دوسری طرف تم مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیا میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ اور کیا تم میری طرف دیکھ رہے ہو، اتفاق سے یہ جاننے کے لئے جب ہماری نگاہیں آپس میں ٹکرائی تو تمہارے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوتا میں نظریں ہٹانے کے باوجود بھی ہٹا نہیں سکتا۔ تمہارا تبسم میرے دل کو گویا جگا تا تھا۔

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے تمہیں قریب آنے کو کہا۔ تم نے سینڈل اتار کر اسے ہاتھ میں لیا شلوار کا پانچا اوپر اٹھایا اور اپنے پاؤں پانی میں رکھ کر آہستہ آہستہ نالہ عبور کیا۔ گھٹنوں تک تمہارے ٹانگیں پانی کے ساتھ میرے دل کو چھو رہی تھیں۔ جب تم میرے سامنے کھڑی ہو کر سنڈل لگا رہی تھی تو کسی نے مجھے مسعود شوقین کے نام سے پکارا، تم گویا چونک اٹھی تھی۔ تمہارے اس چونک اٹھنے کی ادا دیکھ کر مجھے کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ جس نے مجھے پکارا تھا وہ میرا قریبی دوست تھا لیکن اس وقت مجھے وہ اپنا رقیب لگا۔ میں نے تمہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا تم ایک تابعدار بن کر میرے ساتھ ہو لی۔ کچھ شکوے ہوئے کچھ شکایتیں ہوئیں اور یہ سب کچھ اچانک ایسے ہوا گویا ہم زندگی کے دو پرانے ساتھی تھے۔ ہم دو پُرانے ساتھیوں کی طرح سیر کو چل دیئے تھے۔ راستے میں صرف آرٹ کی باتیں۔ آرٹ کی اہمیت اور اُس کی عظمت کے بارے میں باتیں ہوئی تھیں۔''

''میں آرٹ کی بہت شوقین ہوں''۔ تم بولی تھی

''کوئی بات نہیں۔ میں بھی تو مسعود شوقین ہوں''۔ میرے اس جواب سے تم کچھ شرما گئی تھی۔

اس روز گھوم پھر کر ہم اسٹوڈیو میں آئے تھے۔ یہاں تم میرے بنائے ہوئے ماڈل، اسکیچ اور نئی پرانی تصویروں میں ایسی کھو گئی تھیں جس سے پتہ چلتا تھا۔ تم آرٹ کے ساتھ آرٹسٹ کی بھی بہت شوقین ہو۔ میرے آرٹ کے نمونوں کو دیکھتے پرکھتے جو

مفید مشورے تم نے مجھے دیئے تھے۔ اس سے میں تمہاری قوت نقد کا قائل ہو گیا تھا۔ تم نے کن آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

''کیا آپ مجھے یہ کام سکھا دیں گے؟''

''یہاں آیا کرو میں سکھا دونگا'' میں نے جواب دیا تھا۔

اس کے بعد تم واقعی ہر دوسرے تیسرے میرے اسٹوڈیو میں آ ٹپکتی تھیں۔ لیکن آرٹ کا کام سیکھنے کے بجائے تم آرٹسٹ کو سیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اپنے ہاں تم کو پا کر میں سب کچھ بھول جایا کرتا تھا۔ البتہ جب کبھی میں کسی ماڈل میں رنگ بھرنے میں مصروف ہوتا تھا تو تم میرا ہاتھ پکڑ کر سیر کرنے کو ضد کرتی تھیں۔ میں انکار کرتا تھا تم اصرار کرتی تھیں۔ تمہارے اس اصرار میں کتنا پیار اور کتنا خلوص ہوتا تھا۔ تمہارے قریب رہتے ہوئے میں کس قدر زندگی کے نزدیک آ گیا تھا۔ اور میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ اگر تم نے یہ ساتھ چھوڑ دیا تو...... میں زندگی سے ہاتھ دھو کر رہ جاؤں گا۔''

''یہ کیا کہا تم نے، کیا ہو گیا تمہیں؟'' تم نے اس انداز سے اعتراض کیا تھا جس میں پیار، سچائی اور خلوص تھا، اس پیار، خلوص اور سچائی میں جھانک کر......، تم دیکھ رہی تھیں۔ مجھے کچھ کچھ نشہ ہونے لگا تھا اور تمہاری آنکھوں میں پیار کا خمار تیرنے لگا تھا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک تم مجھے نہیں ملی تھیں۔ اور اتنے دن میں میں کس طرح گزارے، جب تمہیں میری زبان سے پتہ چلا تو تمہیں کچھ عجیب سا لگا تھا...... میرے اسٹوڈیو میں آ کر جب تم نے ان دنوں کی بے ترتیبی دیکھ کر ایک آہ بھر لی تھی۔ تم میری اس حرکت پر روٹھ گئی تھیں۔ اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔

اُس وقت میں نے ایزل پر ایک نیا کینوس چڑھایا تھا۔ میں ماڈل بنانے میں مصروف تھا۔ اس وقت تمہارے دل میں جو خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے کہاں چھپی رہتی۔ چنانچہ میں نے تمہاری اسٹڈی کرنی شروع کی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت تمہاری عجیب کیفیت تھی۔ کبھی تم مجھ سے کوئی شکایت کرنا چاہتی تھیں کبھی میرا ہاتھ

بتانا چاہتی تھیں۔ جب تمہیں پتہ چلا کہ یہ میرا پیار لے ہوئے موڈ کو ایک طرف رکھ کر دوسرے پہلوؤں سے میرا مطالعہ کرتا ہے۔ تو تم...... تمہارے دل میں یہ چاہت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مجھے موڈ ٹھیک کرنے کے ساتھ پوز کرنے کے لئے کیوں ہیں کہتا ہے۔ اس روز تم رنگین پھولوں والی سرخ ساری میں ملبوس تھیں۔ تمہاری چھاتی کا بلاؤز کافی چست تھا۔ تم اسٹول پر آ کر اپنے پوز میں بیٹھ گئی تھیں۔ تم نے دائیں ہاتھ سے ساری کا پلو نیچے سرکا دیا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ کو تم آگے لے آئی تھیں۔ میں نے تمہارا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ اس وقت تمہاری جوانی کے اُبھرتے ہوئے اس وجود میں کوئی ایسی ہستی ہویدا ہو رہی تھی جس نے تمہارے اندر ایک قسم کا جنون بپا کر دیا تھا۔ لیکن اس قت تم جنون میں بہنے کے بجائے اس پر پورا قابو پا رہی تھیں۔ میں تمہارے پوز کو درست کرنے کے لئے تمہارے پاس آیا تھا۔

...... تمہیں یاد ہوگا جب میں نے تمہاری بانہوں کو پکڑ کر تمہیں کھڑا کیا تھا۔ تو تم اس لمس سے کس قدر مسحور ہو چکی تھیں۔ تم میرے ہر خاموش حکم کی تعمیل کر رہی تھیں۔

کملا! اس روز تم کتنی حسین لگ رہی تھیں۔ اس وقت تمہاری جوانی کے شعلے کی حرارت ایک لمس سے میری روح میں سمائی جا رہی تھی۔ اور میں تمہیں دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''تم کیا دیکھ رہے ہو؟'' کتنی مشکل کے بعد جوان پیمانوں کو گردش دے کر تمہاری زبان سے اتنا نکل گیا تھا۔ حالانکہ تم جانتی تھیں۔ یہ میرا مطالعہ کرتا ہے۔ میں نے تمہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس وقت تمہارے چہرے پر جو دوشیزگی کے سرخ خون کی جھلک نمودار ہو چکی تھی۔ میں اس کا پینٹ بنانے لگا تھا۔ اور جب تم نے چابکدستی سے اپنے چہرے پر جوانی کے سرخ خون کی جھلک میرے رنگوں میں سے نکلتی دیکھی تو تمہاری آنکھوں میں عشق کا خمار پیدا ہو گیا تھا۔

میں چہرے کا مشاہدہ کرنے لگا تھا۔ تمہاری آنکھوں کے خمار نے مجھے فوراً اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ تم کو یاد ہے کملا!۔ نہ جانے اس وقت مجھے کیا ہوا تھا۔ تمہارے چہرے

کی جھلک اور آنکھوں کے خمار نے میرے ہوش منجمد کر دیئے اور میں......تم میری یہ حرکت دیکھ جنون کی حد تک مسحور ہو گئی تھیں۔ مجھے اپنی اس حرکت پر سخت ندامت ہوئی تھی اور بُرش پھینک کر میں باہر چلا گیا تھا۔

"تم شام تک میرا انتظار کرتی رہی تھیں۔ مگر میں کئی دنوں تک اپنے اسٹوڈیو میں نہیں آسکا تھا۔

"کیا تم میری تصویر مکمل نہیں کرو گے؟" ایک روز تم نے مجھ سے شکایت کی تھی۔ ......قریب تھا کہ میں تمہیں کوئی جواب دیتا تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اسٹوڈیو لے آئی تھی......تم اسٹول پر اپنے پوز میں بیٹھ گئی تھیں۔ بُرش اُٹھا کر جب میں نے تمہاری طرف دیکھا تو اس وقت تم حسن کی مدافعانہ جدتوں کو واقعی شکست دے رہی تھیں۔ میں تمہاری طرف ایک ادا سے دیکھنے لگا تھا۔ تم کو ہنسی آ گئی تھی اور میں ایک لمبی سانس لے کر بولا تھا۔

"کملا! آج مجھے تمہارا اپنا ماڈل بنا کر پینٹ کرنا پڑے گا"۔

"کتنی بار تم نے میرا ماڈل بنایا، میری اسٹیڈی کی؟" تم نے شکوہ سا کیا تھا۔

"کملا......! جب تک تم زندہ ہو میں تمہاری اسٹیڈی کرتا رہونگا۔ چاہیے کتنی ہی تصویریں مکمل کیوں نہ ہو جائیں کیونکہ تم ہر روز نت نئے رنگ روپ میں میرے وجود پر چھا جاتی ہو......"

"اب باتیں بناؤ گے یا تصویر......؟" تم نے خمار آلود پیمانوں کو گردش دے کر کہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرے ہوش منجمد ہو گئے تھے۔ اور اس کے بعد میں اپنے کام میں مصروف ہوا تھا۔ تم دیکھ رہی تھیں، جب میں تمہارے سینے کے اُبھار کو پچ دے رہا تھا۔ اس وقت تمہاری چھاتی انتہائی جمالیاتی عظمت کے ساتھ صوفشاں تھی۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا تھا اور تم ایک دم کھڑی ہو گئی تھیں۔ میرے پاس آ کر تم گویا نڈھال ہو کر بولی تھیں۔

"شوقین......! میں نے تمہیں اپنے جیون کا ساتھی جان لیا ہے۔ تم مجھے دھوکہ تو نہیں دو گے؟"

''یہ سوال میں بھی تم سے کر سکتا ہوں'' میں نے عاشقانہ انداز سے کہا تھا۔ غیر ارادی طور پر ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں آ گئے تھے...... میں نے کچھ دیر کا سکوت توڑا تھا'' کملا......! تم جانتی ہو کہ ہمارے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی ہے جس کو ہم نے مذہب کا نام دیا ہے۔ اگر تم اس میں میری صفائی چاہو گی تو میں یہی کہہ سکتا ہوں۔ میں ایک فنکار ہوں۔ فن ہی میرا دین و مذہب ہے''۔

''تم نے یہ ذکر چھیڑ دیا تو سُن لو؟'' تم نے نڈر ہو کر کہا تھا۔

''اگر تم آرٹسٹ ہو تو میں ادیب ہوں۔ آرٹ اور ادب دونوں فن میں شامل ہیں۔ تمہارا دین اگر فن ہے۔ تو مرا دھرم ادب ہے۔

''کملا......! مجھے تمہارے ان خیالوں کا قائل ہونا چاہئے۔'' میں بے اختیار ہو کر بولا اور اس کے بعد تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر سیر کے لئے جانا چاہا حالانکہ اُس روز میرا میلان تمہاری تصویر کے ساتھ قدرتی نظاروں کو پینٹ کرنے کا تھا۔

اس طرح ہم آپس میں ملتے رہے۔ اکٹھے گھومتے پھرتے رہے۔ تم کو یاد ہو گا ایک روز تم نے مجھ سے کہا تھا۔

''شوقین! اب تم میری تصویر کو مکمل کر لو، یہ ایک یادگار رہے گی۔''

میں نے کہا تھا...... ''اگر میں تصویر کو مکمل کر لونگا تو تم مجھے کیا انعام دو گی؟''

''میں تمہیں وہ انعام دونگی جس سے تم کافی خوش ہو گے''۔ تم نے کہا تھا

''بہت خوب۔ کل تم اسٹوڈیو میں آنا'' میں نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا تھا۔

اگلے روز تم سویرے آئی تھیں۔ میں تصویر کو مکمل کرنے لگا تھا۔ تم کو یاد ہے۔ تصویر مکمل کر کے میں نے تم سے انعام مانگا تھا۔ تم شرما کر بولی تھیں۔

''میں نے تمہیں اپنی جوانی میں رنگ بھرنے کا موقعہ دیا اور تم مجھ سے انعام مانگ رہے ہو......''

''اب باتیں نہ بناؤ۔ مجھے انعام دو'' میں نے کہا تھا۔ اور تم گردن جھکا کر بولی تھیں۔

''میری یہ جوانی، تیرا انعام ہے۔''

میں نے تھوڑی دیر کا سکوت توڑ کر تم سے پوچھا تھا۔

''کملا......! بتاؤ اس کا عنوان کیا رکھدیں گے؟''

''جوانی کی بہار'' تم نے فوراً ہی کہدیا تھا۔ گویا یہ عنوان تم نے اس کے لئے پہلے ہی چن رکھا تھا۔ میں نے تمہارے اس عنوان کی تائید کی تھی۔ تم کو یاد ہوگا۔ اُس روز کام سے فراغت پا کر ہم ایک نئے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ اس سفر میں ہم پیار و محبت کی وادیوں میں کھو گئے تھے۔ ہم ذات اور مذہب کو بھول کر ایک ابدی رشتے میں سمور ہے تھے۔ اپنے سوا ہمیں اور کسی چیز کا پتہ بھی نہیں تھا۔

ایک دم حالات بدل گئے۔ وادی میں گن گرج شروع ہوگئی۔ جلسے اور جلوس کے بعد جگہ جگہ خون بہنے لگا تو تم کو اپنی کمیونٹی کے ساتھ وادی کو چھوڑنا پڑا اور مجھے سرحد پار جانا پڑا۔

مِس کملاوتی......! میں سرحد کے اس پار آرٹسٹ ہوں۔ میں نے سُنا ہے تم ادیب سے وزیر بن گئی ہو۔ ویسے میں جانتا ہوں اگر تم میں پوری ادبی صلاحیت ہوتی تو تم ہرگز وزیر نہ بنتیں۔ خیر جو کچھ کیا ٹھیک کیا، آج کل تو تمہارے ہاتھ میں بہت کچھ ہے۔ آج تم ریاستی آرٹسٹوں کے کلب کی صدر کی بھی حیثیت رکھتی ہو۔ آج تم کو آرٹسٹوں کے آرٹ انعام کے لئے منتخب کرنے ہیں...... بتاؤ میرے نام کون سا انعام رکھنے کا خیال ہے۔ کیونکہ ''جوانی کی بہار'' نے راہداری میں ہی تمہاری ٹانگیں جکڑ لی ہیں۔ بتاؤ جلدی جلدی کیا ہے۔ تیرا انعام......؟''

''میری جوانی......!'' اپنی تصویر کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے اُس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اُس کی اس آواز سے سب کے سب سٹپٹا گئے۔ اور جب اُسے اسبات کا احساس ہوا میں آرٹ ایگزبشن کا افتتاح کرنے اندر جا رہی ہوں تو مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہوگئی۔ اور جلدی جلدی اپنے چہرے سے خفت مٹانے لگی۔

''کیا فرمایا آپ نے؟'' اکیڈمی کے سیکرٹری نے سامنے آکر پوچھا۔

وہ تیور بدل کر بولی۔

''دیکھئے، پہلا انعام اس کو دینا''۔

''انعام......لیکن یہ آرٹ......''سیکرٹری نے تعرض کیا۔

''یہ آرٹ تو سرحد کے اُس پار والے......''

''مگر آرٹ تو سرحد کے اُس پار نہیں ہے......میں کہہ رہی ہوں پہلا انعام اُسی کو دو......''

''لیکن شرائط......؟''سیکرٹری بولا۔

''کیا شرائط ہیں۔؟ مجھے بتاؤ۔''

''شرائط کی رو سے سرحد کے اُس پار رہنے والے آرٹسٹ اس مقابلے میں شرکت کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ سب آرٹ ہم نے ہال سے باہر اسی لئے رکھ دئے ہیں۔

''لیکن آرٹ کو ہال سے باہر رکھ دینے سے اُس کی قدر و قیمت اس کی عظمت گھٹ نہیں سکتی ہے''۔ اُس نے ترشروئی سے جواب دیا۔ قبل اس کے کہ سیکرٹری کچھ اور کہتا وہ طویل وقفہ کے بعد خود ہی بولی۔

''آرٹ کو ہال سے باہر رکھ دینے یا آرٹسٹ کو سرحد کے اُس پار بھیج دینے سے آرٹ کا بٹوارہ نہیں ہو سکتا ہے۔ آرٹ فن کا ایک حصہ ہے۔ فن ملک اور قوم کا معمار ہوتا ہے اور کوئی بھی معمار ملک اور قوم کی تعمیر کرتا ہے نہ کہ بٹوارہ۔

......اور! اچانک اسے کوئی خیال آیا اور وہ ماحول کو جھانک کر پریشان انداز میں کچھ بے صبری سے بولی۔

''معاف کرنا، یہ میرے نہیں بلکہ اس آرٹ کے تخلیق کار کے الفاظ ہیں۔ اور یہ سب میں ریاستی ثقافت کی وزیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ آرٹ کی شوقین کملا کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں۔

❀❀❀

مینڈک

''تمہیں بیٹی کے پاس ہونے کی خبر سن کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی کیا!؟''

''ہاں، بڑی خوشی ہوئی...... کس کلاس میں اب جارہی ہے وہ؟''

''کمال ہے، تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہماری نیلم اب دسویں پاس کرگئی ہے!''

''اچھا! ......بھئی اس نے تو کمال کر دیا، اتنی سی بچی دسویں کلاس پاس کرگئی، ہمارے وقت میں......کیا عمر ہوگی اس کی؟''

''اچھا تو تم اس کی عمر بھی بھول گئے۔ابھی پچھلے ہی مہینے اس کی سال گرہ جو منائی تھی''۔

''سال گرہ تو ہم مقررہ تاریخ پر ضرور مناتے ہیں لیکن یہ کہاں یاد رکھتے ہیں آج تک کتنے جنم دن منائے اور بیٹی کتنے سال کی ہوگئی''

''پندرہ سال کی ہوگئی ہماری نیلم''

''اس کا مطلب ہے ہماری شادی کو پورے سترہ سال ہوگئے ......بھئی مجھے تو لگتا ہے گویا یہ کل کی بات ہے، نہ جانے یہ وقت اتنی جلدی چھوٹ کر کہاں جاتا ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہاں! وقت کچھ زیادہ ہی تیز بھاگ رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا؟''

''مجھے تو ایسا محسوس ہورہا ہے پہلے کے مقابلے میں آج کل کے بچے جسمانی طور پر کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگے ہیں......تمہارا کیا خیال ہے......؟''

''میرے خیال میں بچے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ شعوری طور پر بھی جلدی جلدی بڑھ رہے ہیں اور لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں کچھ زیادہ ہی''

"ہمارے وقت میں ہمارے خیالات زمین پر گاڑی کی رفتار کے مانند دوڑ بھاگ
رہے تھے۔ لیکن ہمارے بچوں کے خیالات سپر جیٹ کی رفتار کے مانند اور وہ بھی اونچے آسمانوں پر اڑ رہے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔

"اس میں ان بچوں کا کیا قصور، یہ تو وقت کا تقاضا ہے"

"بھئی......! میں نے کب کہا اس میں ان کا قصور ہے۔ ہم آج ان کی طرح بچے ہوتے تو ......خبر جانے دوان باتوں کو یہ بتاؤ نیلم میٹرک کے بعد کس کالج میں پڑھنے جائے گی!"

"وہ ایم پی کالج میں جانا چاہتی ہے"۔

"مگر ایم پی کالج تو کافی دور ہے، بس سے آنا جانا پڑے گا اور یہاں سے بس اسٹینڈ بھی نزدیک نہیں"

"اب وہ تمہاری طرح کب تک کنویں کی مینڈک بن کر رہے، جانے دو جہاں اس کا جی چاہتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن......"!

"لیکن کیا......تم کس سوچ میں پڑ گئے؟"

"میرے خیال میں لڑکیوں کو روزانہ اتنی دور نہیں جانا چاہیے، زمانہ خراب ہے، راستے میں......"

"کیا، راستے میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں......یہ......میرا مطلب ہے یہ آوارہ لڑکے راستے میں لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں نا!"

"او، ہو......تم تو دور کی کوڑی لے آئے......ایسے لڑکے تو ہم جیسی عورتوں کو بھی نہیں بخشتے، سب اپنے آپ پر منحصر ہے۔ کوئی کچھ کہے اپنا من صاف ہونا چاہیے اور ہماری نیلم......وہ بے چاری ابھی اس اونچ نیچ سے بالکل بے خبر ہے"۔

"اسی لئے میں کہہ رہا ہوں باہر جا کر وہ اس اونچ نیچ سے واقف ہو جائے گی، آتے

جاتے راستے میں دوسروں کے ساتھ اس کی جان پہچان ہوگی اس کا میل جول بھی بڑھے گا"۔
"لیکن اس میں بُرائی کیا ہے۔ زندگی کا تجربہ تو اسی طرح حاصل ہوتا ہے......اور جو خدشہ تمہیں ستا رہا ہے تم اس خدشتہ کو ذہن سے نکال دو ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے"۔
"ہاں......تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن......لیکن......
"یہ تم پھر کس سوچ میں پڑ گئے......؟"
"ایک بات بتاؤں، بُرا تو نہیں مانو گی؟"
"نہیں تو......بتاؤ"!
"ہماری نیلم کو ابھی پڑھنا ہے، اسے اپنا کیریر بنانا ہے، میرا ااارادہ اسے ڈاکٹری پڑھانے کا ہے۔
"میری بھی یہی تمنا ہے"
"مگر یہ سب تب ہی ممکن ہو سکے گا، جب وہ اپنا سارا دھیان اپنی پڑھائی کی طرف لگائے گی اپنا کیریر بنانے........." اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور کچھ سوچنے لگا۔
"خاموش کیوں ہو گئے......کیا سوچ رہے ہیں؟"
"چلو میں مان لیتا ہوں کہ میں کنویں کا مینڈک تھا اور مجھے بیٹی کو کنویں کا مینڈک بنانا نہیں۔ لیکن اب وہ اپنے علاقے سے باہر نکل کر نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہے۔ اس لئے جو بھی قدم اس کا اٹھے گا وہ سوچ سمجھ کر اٹھے گا۔ بھگوان نہ کرے اگر وہ غلط راستے پر چلنے لگی تو اس طرح نہ صرف اس کا اپنا مستقبل خراب ہو جائے گا بلکہ گھر بار کی عزت پر بھٹہ لگے گا اور خاندان......وہ تو رسوا ہو جائے گا"۔
"تمہارا کہنا صحیح ہے لیکن نیلم کے بارے میں تمہیں بے فکر رہنا چاہیے۔ ہماری نیلم کبھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گی"
"وہ تو مجھے بھی اس پر بھروسہ ہے......خیر جانے دو، یہ تو بتاؤ وہ اس وقت کہاں ہے؟"
"وہ رنکو کے ساتھ ٹینس کھیل رہی ہے......پارک میں!"

''یہ رنکو کون ہے......؟''

''ہمارے پڑوسی کا بیٹا، بہت اچھا لڑکا ہے''

''ہاں...... بہت ہنس مکھ لڑکا ہے...... مجھے وہ بہت پسند ہے......!''

''تمہیں دفتر جانے میں دیر ہو رہی ہے''

''او، ہاں...... اچھا میں جا رہا ہوں!''

''دوا نہیں لو گے...... میں نے پانی کا گلاس اور کیپ سول کی بوتل میز پر رکھ دی ہے۔''

''جتنی پابندی سے مجھے یہ کیپ سول کھانے پڑ رہے ہیں، اتنا ہی میں اپنی یاد داشت کھوتا جا رہا ہوں۔

''تم اس کیپ سول کو ہاتھ میں لے کر گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟''

''جانتی ہو، جو شخص یہ تین کیپ سول ایک ساتھ کھائے گا وہ زندہ نہیں بچے گا''

''ہاں، زیادہ تعداد میں دوا کھانا زہر کھانے کے برابر ہے''۔

''دیکھو تم یہ تین کیپ سول نیلم کو دے دینا''۔

''کیوں......''؟

''تم بے شک اسے کہدو، یہ تمہارے باپ کی طرف سے دی ہوئی امانت ہے اس کو حفاظت سے رکھنا اور اگر کبھی زندگی میں تم نے اپنی عصمت کے ساتھ خیانت کی تو ماں باپ کی عزت کا خیال کر کے یہ تینوں کیپسول ایک ساتھ کھالینا۔

''تم کو یہ کیا ہو گیا...... تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے مجھے یہ کیا ہو گیا...... لیکن یہ کیپ سول اُسے دینا نہیں بھولنا...... میں جا رہا ہوں''

''...... دوسرے روز صبح جب نیلم کی ماں اسے جگانے گئی تو وہ ابدی نیند سو چکی تھی۔ اس نے تینوں کیپ سول رات کو ہی کھالیے تھے۔ سرہانے پرٹنکو کی تصویر تھی۔

پھول بنے انگارے

اور پھر ایک چھناکے کے ساتھ یہ آواز گونجی کہ دھرتی کا پہلا انسان عرش پر آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کم از کم وہ ایک مصنوعی سیارہ ہی خلا کی طرف داغ دیتا، تواریخ بتاتی ہے۔ دریا کے کنارے ایک انسان کھڑا تھا۔ مگر دریا میں زیادہ زور و شور نہیں تھا۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے اُس روز پہلا ہاکر اپنے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اخبار کی تازہ خبر پڑھنے نکلا تھا۔ ایک حیرت ناک آواز گونجنے سے پہلے دریا کے کنارے کھڑا انسان اپنی شکل و عقل اور اپنی قسمت سے بیزار تھا اور عرش پر جاتے جاتے جب خلا میں گردش کرنے لگا تب......

پھر ایک چھناکے کے ساتھ یہ آواز گونجی کہ عرش کا پہلا انسان دھرتی میں ڈوب گیا۔

ان دنوں اکثر لوگوں نے یہ قیاس بھی کیا تھا۔ ایک غریب مگر نیک انسان دریا کے کنارے کھڑا نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ وہ سطح آب پر اپنی صورت کو اس طرح ہلتے منتشر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ مصنوعی سیارہ میں بیٹھا گردش کر رہا ہو۔ کیونکہ اسوقت ایک ہاکر اس کی کامیابی کا اعلان کر رہا تھا۔ جب اسے اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ میں کامیابی کی ساری حدود پار کر کے فرش سے عرش پر آ گیا ہوں۔ تو وہ اپنا دماغی توازن کھو کر تھرتھرایا اور دھڑام سے دریا میں کود گیا۔ مگر یہاں نہ کوئی دریا تھا اور نہ ہی پانی۔

بوڑھی ماں عام لوگوں کے ساتھ شہر کے بڑے بڑے امیروں، رائیسوں، ڈاکٹروں، تاجروں اور ہمسایوں کو بھی آج اپنے ہاں دیکھ کر حیرت کے دریا میں اسی طرح ڈوب رہی تھی، جس طرح اس کا بیٹا شادمرگی میں گویا دریا میں ڈوب گیا تھا۔ سارے شہر میں نہ صرف سلطان کے نام دس لاکھ روپے کی لاٹری نکلنے کا چرچا بھی ہو رہا تھا...... آج

سلطان کو بھی جانتے تھے۔ سب اس کے یار دوست تھے۔ سب سیٹھ ساہوکار اس کے ساتھی تھے۔ آج کے بجائے اگر سلطان کبھی کسی گاڑی کے نیچے آکر مر بھی گیا ہوتا تو شاید ہی کسی کو اس کے مرنے کی خبر ہوتی۔ موت کی دُنیا سے لوٹ آکر جب سلطان دس لاکھ روپے کا تصور کرنے لگا تو وہ شادمرگ ہونے لگتا تھا۔ لوگ جوق در جوق یہاں آرہے تھے اور اس کو اتنی بڑی رقم پانے پر مبارکباد دے کر جارہے تھے۔ اڑوسی پڑوسی رشک و حسد کو ایک طرف رکھ کر انہیں نظر آ.م سے بچنے کے لئے نذر و نیاز دینے کی تلقین کرتے تھے۔ اور بہت ساری باتیں بتا کر واپس جاتے تھے۔ بوڑھی ماں جب اکیلے میں ان سب باتوں کو جو وہ دوسروں کی زبانی سُنتی ان پر غور کر لیتی تھی تو اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا تھا۔ اور غور و فکر کے آخری مرحلے تک پہنچ کر وہ ہر بار اپنے آپ سے کہنے لگتی تھی "یہ لوگ کیا کہتے ہیں......؟ میرا بیٹا شادمرگ کیوں ہو گیا تھا......؟ وہ دریا کے کنارے کون سی خبر سُن کر دریا میں ڈوب گیا تھا مگر جہاں پر اُس نے یہ خبر سنی وہاں نہ دریا تھا اور نہ ہی پانی" اور جب اسے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ تو وہ پریشانی کے ساتھ حیران بھی ہوتی تھی۔

بوڑھی ماں کے پاس روپے پیسے کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ چاہیے روپے ایک ہو، ایک سو، ایک ہزار یا ایک لاکھ اور نہ ہی دس لاکھ جو اچانک اس کے بیٹے کو ملے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ روپے کو نظر حقیر سے دیکھتی تھی۔ اس لئے بھی نہیں کہ وہ سرمایہ داری کے خلاف تھی۔ دراصل وہ ایسی بدنصیب بوڑھی تھی۔ جس نے بچپن سے لے کر اب تک نہ اپنے ہاتھوں روپے پیسے خرچ کئے تھے نہ کبھی اس کے پاس روپے رہے تھے۔ وہ اتنا بھی نہیں جانتی تھی روپے سے سب کچھ بنتا ہے۔ روپے سے شان و شوکت باقی ہے۔

وہ سادہ لوح تھی۔ اس کی نظر میں رہنے کو جیسا بھی ہو ایک ٹھکانہ ہو، پیٹ پالنے کے لئے روکھی سوکھی ہو اور تن ڈھانپنے کے لئے جیسا بھی ہو چتھیرا ہو، اپنی زندگی میں اس نے اس کے سوا کچھ دیکھنے دیکھنے کی خواہش کی اسے ہوئے کافی وقت ہو چکا تھا۔

اس کا اثاثہ صرف ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا اور یہی اولاد اس کی ساری دھن دولت اور ساری خوشی تھی۔ اگر اُسے کسی چیز کی تمنا تھی تو بس یہ تھی کہ میری اولاد پھلے اور پھولے، گھر میں ایک بہو اور ایک داماد ہو اور زندگی کی ایک وہی گردش ہو۔

تواریخ کہتی ہے جب ہندوستان میں پہلی اونچی عمارت بنی اس وقت لوگوں کے خیالات اس عمارت سے بھی اونچے ہو گئے تھے۔ پھر بھی لوگ دور دراز سے اس اونچی عمارت کو دیکھنے آئے تھے۔ کہتے ہیں اس وقت ایک شخص نے اس اونچی عمارت کی طرف دیکھ کر فخر سے کہا تھا جب میں اس عمارت پر چڑھ جاؤں گا تو آنکھیں کھول کر میں مفت میں سارے ہندوستان کا نظارہ کروں گا۔ مگر دوسرا شخص سامنے آ کر فوراً بولا تھا۔ جب میں س اونچی عمارت پر چڑھ جاؤں کا تو آنکھیں بند کر کے اوپر سے نیچے گرتے ہوئے خودکشی کرونگا۔ کہتے ہیں اسی وقت قطب مینار نے اس تضاد کو دیکھ کر اپنی حیثیت سے اونچا ہونے سے صاف انکار کیا تھا۔

زمانہ کہتا ہے۔ سلطان اپنی خاندانی روایات کے مطابق بڑا سیدھا سادہ تھا۔ محنت مزدوری کر کے اپنے ساتھ بہن اور بوڑھی ماں کو پالتا تھا۔ وہ غریب ضرور تھا مگر نیک و رحمدل تھا۔ وہ جیسی بھی گزارتا تھا لیکن اپنے حال میں مطمئن تھا۔ وہ زمانے کے گورکھ دھندوں، سیاسی ہنگاموں اور مذہبی تنازعوں سے بالکل علیحدہ اپنی زندگی گزارتا تھا۔ اس کی بہن بھی بڑی شرمیلی تھی۔ جوانی سے ڈھلنے کے باوجود بھی اس میں لغزش نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دل میں صفائی اور پاکیزگی بھری پڑی تھی۔ دونوں بہن بھائی کو اپنی بوڑھی ماں سے از حد محبت و عقیدت تھی۔ انہیں اس بات پر پورا اعتماد تھا۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔

سلطان سے جب پوچھا جاتا تم اس اتنی دولت کو کیا کرو گے تو فخر سے جواب دے دیتا تھا۔ میں یہ ساری دولت مسجدوں اور آستانوں کی بھینٹ چڑھاؤں گا۔ لاچاروں اور تنگ دستوں میں خیرات کروں گا بیکسوں کی امداد کروں گا۔

اس کے اس جواب سے سب خوش ہو جاتے تھے۔ اور لگے ہاتھوں سرمایہ داروں کو

گالیاں دینے لگتے تھے۔ جو سرمایہ سے سرمایہ جمع کرتے ہوئے مسکینوں کا گلہ گھونٹتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ جو دولتمند ہوتے ہوئے بھی دولت کے لئے دن دھاڑے ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ جو اپنی تجوریاں بھرنے کے لئے نیکی شرافت اور انسانیت کو دفناتے ہیں۔ مگر ایک غریب جب اچانک دولتمند بن جاتا ہے تو وہ اپنی سچائی، شرافت اور انسانیت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

سلطان نے یہ ساری رقم بنک میں جمع کر دی البتہ اس میں سے ایک لاکھ روپے لا کر ماں کے دامن میں ڈال دیئے۔ ایسا کر کے گویا ایک بہت بڑے فرض سے چھٹکارا پا کر یقیناً اس نے جنت حاصل کر لی تھی، ویسے بڑی رقم پانے کے بعد وہ باہر بہت کم نکلتا تھا۔ اس کے دل میں عجیب وسوسے عجیب خیالات اور بہت سارے مسائل پیدا ہونے لگے۔ اسے اپنے آپ میں غیر معمولی تبدیلی بھی دکھائی دی۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات جنم لینے لگے۔ اکیلے میں جب وہ اپنی زندگی کے ساتھ کسی دولتمند کی زندگی کا موازنہ کرنے لگتا تو اُسے اپنے ساتھ اپنے ان خیالات پر بھی گھن آنے لگتی تھی۔ لیکن وہ اپنے پرانے لبادے چھوڑ کر وہاں ضرور جانا چاہتا تھا جہاں زندگی میں حسرتیں نہیں بلکہ مسرتیں ہوتی ہیں۔

وہ دن میں کئی بار ان روپیوں کو دیکھ لیتا تھا اور گھنٹوں ان کو تکنے لگتا تھا۔ روپیوں کو تکتے تکتے اپنے ساتھ اپنی موجودہ پوزیشن کو بھول کر اپنے آپ کو وہاں دیکھ لیتا تھا۔ جس کا ایک عام انسان خیال ہی کر سکتا ہے۔ سوچ کی اس دنیا سے لوٹ آ کر جب آپ ہی آپ اس کے منہ سے ''کاش'' نکلنے لگتا تو اس میں ایک حرکت سی پیدا ہوتی تھی۔ اور فوراً اس کے اندر کوئی کہہ دیتا تھا اے نادان دولت کی ڈکشنری میں لفظ ''کاش'' کہاں ہوتا ہے۔

دولت حاصل کر چکنے کے بعد جب سلطان بازار جاتا تھا۔ تو اس کے منہ کے بجائے خیالات میں پانی بھر آنے لگتا تھا۔ اور وہ دل پر ہاتھ رکھ کر اپنی دولت سے

خیالات کا پانی پونچھ لیتا تھا۔

اور بوڑھی ماں سوچنے لگتی تھی۔ کیا ایک لاکھ روپے اتنے ہوتے ہیں۔ جن سے ہمارے لئے اتنے اچھے کپڑے اتنا سارا سامان آسکتا ہے۔ جب کبھی سلطان بوڑھی ماں اور بہن کو کہہ دیتا تھا۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے، بلکہ کسی اور جگہ جا کر رہنے کے لئے ایک کوٹھی لیں گے تو اس کی بہن خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی اور بوڑھی ماں......وہ سوچنے لگتی تھی کیا دولتمند بن جانے کے بعد سب اپنے پڑوسیوں سے علیحدہ ہو کر رہتے ہیں اور اپنے آبائی گھر بار چھوڑ دیتے ہیں۔

سلطان کو رفتہ رفتہ اس گندھی بستی سے نفرت ہونے لگی جس میں اُس کی اور اُس کے والدین کی زندگی پروان چڑھ کر آخری منزلیں طے کر چکی تھیں۔ اب تنگ دست، لاچار اور غریب لوگ اس کو بہت بُرے لگنے لگے کیونکہ اس کا اُٹھنا بیٹھنا بڑے بڑے امیروں سے ہونے لگا تھا۔ سلطان کی ان سب حرکات اور بدلتے خیالات کو دیکھ کر بوڑھی ماں سوچنے لگی تھی۔ میرا بیٹا کیوں اپنا آبائی گھر چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ مسجدوں اور آستانوں میں نذر و نیاز دینے کے بجائے اتنی ساری غیر ضروری چیزیں کیوں لا دیتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو کیوں چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ غریبوں کی مدد کرنے کو آج بے وقوفی کیوں جانتا ہے۔ آخر یہ ایک لاکھ روپے کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے صرف ایک لاکھ پر نظر تھی

سلطان خود بھی اپنی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر اپنی نیت کو کوسنے لگتا تھا۔ لیکن کسی کو قیمتی کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر کسی کو شاہانہ کوٹھی میں رہ کر یا کاروں میں گھومتے پھرتے دیکھ کر یکا یک اس کے دل میں حسد بپا ہونے لگتا تھا۔ اپنے آپ میں اس غیر معمولی تبدیلی کو دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اب ان لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ جو شاہانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آخر وہ بھی ایک پُرانی ہی سہی کوٹھی خرید کر ہی رہا۔ کوٹھی حاصل کر چکنے کے بعد اُسے ایک کار کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر میں ایک ہراس سی پھیل گئی۔ سنتے ہی سنتے لوگوں میں ایک زبردست سنسنی پھیل گئی۔

آج درجنوں ہاکر مل کر اس خبر کی تشہیر کر رہے تھے۔ قطب مینار کے سامنے لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو رہا تھا۔

اور سلطان کا نوکر پولیس کے سامنے بیان دے رہا تھا۔

"جناب! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے جو کچھ بھی پتہ ہے۔ میں صاف صاف بتا دوں گا مگر یہ سب بتا دینے سے پہلے......، اگر آپ مجھے موقعہ دیں گے تو میں اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے سلطان، اس کی بہن اور بوڑھی ماں کی زندگی کا مختصر تجزیہ کروں گا کیونکہ میرے اس بیان کی روشنی میں آپ کو میرے اس تجربہ سے اس واقعہ کے بارے میں بہت مدد ملے گی۔ جناب......! میں سلطان کو نہ صرف کافی دیر سے جانتا ہوں بلکہ مجھے اس کے نزدیک رہنے کا بھی موقع ملا ہے۔ جب تک وہ غریب تھا۔ وہ بڑا نیک اور شرافت کا مجسمہ تھا۔ اس کی بہن بھی بری شرمیلی پاکیزہ اور ملنسار تھی۔ ماں کے بارے میں تو میں یہی کہہ سکتا ہوں وہ بیک وقت دیوی تھی۔ آپ اُس کو جانتے نہیں ہیں وہ بالکل سادہ لوح تھی۔ اس کا سارا اثاثہ اس کے دو پھول تھے۔ اور وہ دونوں بھی بوڑھی ماں کی پوجا تک کرتے تھے۔ پھر جناب......! آپ جانتے ہیں سلطان ایک دم غریب سے امیر بن گیا۔ اور فرش سے عرش پر پہنچ گیا۔ عرش پر پہنچ جانے کے بعد قدرتی طور پر اس کے خیالات بلند ہوئے۔ رفتہ رفتہ اُسے غریب لوگوں سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اپنے رشتے داروں، اڑوسی پڑوسیوں یہاں تک کہ علاقے کے لوگوں کو بھی چھوڑ کر اس بستی میں رہنے کے لئے چلا جو عرف عام میں پوش کالونی کہلاتی ہے۔

اپنی نئی کوٹھی میں آ کر جب سلطان نے یہاں کے بڑے بڑے لوگوں کی دعوت کی جو اس کی بستی میں رہتے تھے۔ تو اُسے نئے لوگوں کے ساتھ جان پہچان ہوئی۔ ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوا۔ ان لوگوں نے اُسے آہستہ آہستہ زندگی گزارنے اور کاروبار چلانے

کے نت نئے گر سکھا دئے کوئی آ کر اس کی کوٹھی کو ماڈرن طریقے پر سجانے کی نئی نئی ہدایات دیتا تھا۔ کوئی اسکو روپے سے روپے پیدا کرنے کے طریقے بتا دیتا تھا۔ غرض ہر کوئی اس کے ساتھ دوستی گانٹھ لیتا تھا...... اس نئی دنیا میں آ کر سلطان اور اس کی بہن نے محسوس کر لیا اب تک جو زندگی ہم گزار رہے تھے وہ ایک ڈھکوسلہ تھا۔ اصل میں زندگی یہ ہے کیونکہ اس نئی زندگی میں سلطان کو جس طرح نت نئی لڑکیوں سے واسطہ پڑنے لگا تھا۔ اسی طرح اس کی بہن کو نئے نئے یار ملنے لگے تھے۔ جناب......! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ سلطان ہر فلم ایکٹر کی طرف دیکھ کر کپڑے بدلتا تھا۔ اور اس کی بہن چست لباس کے ساتھ میک اَپ بھی استعمال کرتی تھی۔ جناب! نئی سوسائٹی کے ساتھ گھل مل کر دونوں بہن بھائی اب ہوٹلوں کے بعد کلبوں میں بھی جانے لگے۔ اس طرح سلطان کسی نئی لڑکی کے ساتھ اور اس کی بہن کسی نئے یار کے ساتھ جب رات رات بھر غائب رہنے لگے تو بوڑھی ماں سخت پریشان ہوتی۔ اس نے کتنی بار میرے سامنے اپنے بیٹے یا بیٹی کو اس بے حیائی اور بے غیرتی اس عشق اور عاشقی سے باز رہنے کے لئے کہا مگر جناب: سلطان اس کا مزاق اڑا کر کہتا تھا۔

''تم تو دقیانوسی بوڑھی ہو، اسی لئے خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو یہ ایسی ہی سوسائٹی ہے۔ یہاں ایسی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ اس سے پہلے جو زندگی ہم وہاں جھونپڑی میں گزارتے تھے آج میں اس پر طنز کر کے تمہیں اس اسٹیج پر لایا ہوں تم عیش کرو، کھاؤ پیو اور ہمیں گھور گھور کر دیکھو مگر زبان مت ہلاؤ نہیں تو تیری زبان...... میری اچھی ماں!''

سلطان کے اس رویے سے پریشان ہو کر بوڑھی ماں جب کبھی اپنا دُکھڑا بیٹی کو سنا دیتی تھی وہ اس پر ہنس کر کہہ دیتی تھی ''تم تو پُرانے زمانے کی عورت ہو، اس زمانے میں تمہاری کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تم بھی میری طرح جوان ہوتی تو آج اس زندگی کا لطف اٹھاتی'' جناب! ان باتوں سے بوڑھی بے چاری کی جو حالت ہوتی تھی وہ تو ہوتی

ہی تھی۔ لیکن حد یہ تھی ایک طرف اس کا بیٹا کسی نئی لڑکی کو لا کر شراب کی مستی میں اسی کے سامنے رنگ رلیاں مناتا تھا۔ اور دوسری جانب بیٹی اس کے سامنے اپنے نئے یار کے ساتھ جام کے ساتھ جام جسم کے ساتھ جسم ٹکراتی تھی۔ جناب......! ایسا دیکھنے سے بوڑھی ماں کے سوکھے خون میں ایسی گرمی پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ اس کوٹھی کو اُجاڑنے کے بعد اس سوسائٹی کو بھی دفنانا چاہتی تھی...... مگر اس کے پاس اتنی سکت نہ تھی۔ اب میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اس لئے میں اپنے اصلی بیان پر آتا ہوں۔ تو جناب! میں کہہ رہا تھا۔ کل رات جب یہ حادثہ ہوا میں کوٹھی پر موجود تھا۔ سلطان کی بہن چند دنوں کوٹھی سے غیر حاضر رہنے کے بعد واپس آئی تھی۔ شام کو اس نے مجھے لیڈی ڈاکٹر لے آنے بھیج دیا۔ واپسی پر جب میں نے بوڑھی ماں کو اطلاع دی آپ کی بیٹی بیمار ہے تو بوڑھی ماں ہزار ناراضگیوں کے باوجود اُٹھ کر آئی اور بیٹی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی مگر اندر سے جب اسے دروازہ نہ کھولے جانے کا جواب مل گیا۔ تو وہ اپنے کمرے میں آکر گھنٹوں روتی رہی اپنی پرانی اور نئی زندگی کا موازنہ کرتے کرتے خون کے آنسو بہاتی رہی...... جناب! رات کے یہی بارہ بج رہے تھے جب بوڑھی ماں کو پوشیدہ طور پر لیڈی ڈاکٹر کی زبانی پتہ چلا اس کی بیٹی نے اپنے بند کمرے میں حمل گرا دیا ہے، تو...... تو جناب! وہ چکرا کر گر گئی۔ میں نے کافی کوشش کر کے اُسے ہوش میں لایا۔ لیکن جب وہ اپنے ہوش میں آئی تو جناب......! اس نے دیوانہ وار اٹھ کر اس صیف کو توڑ دیا جس کو مجھ جیسے تین آدمی بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ اور اس صیف میں سے اس نے ساری دولت نکال کر بیچ کمرے میں ان کا ایک ڈھیر لگا دیا اور پھر اس ساری دولت پر تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی کیونکہ اس کی نظر میں یہی دولت قصور وار تھی۔ جس نے اسے آج یہ سب دکھا دیا تھا۔ چنانچہ جب اس نے نوٹوں کو آگ لگا دی تو اسی وقت باہر سے سلطان آیا، جب اس نے روپے کے بڑے بڑے بنڈل جلتے ہوئے دیکھے تو جناب......! سلطان اس وقت نشے میں دھت تھا۔ وہ اپنی اس دولت کو جلتے دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ وہ اپنی بوڑھی

ماں کوننگی ننگی گالیاں دینے لگا لیکن جب اس طرح بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی، تو اس نے بوڑھی ماں کو بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر اسی آگ پر رکھ دیا، جب تک کہ اس کے کپڑے میں بھی آگ لگ گئی۔

جناب! میں نے اپنی آنکھوں سے بوڑھی ماں کو اس آگ میں جلتے ہوئے دیکھا میں نے اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔ مگر...... جناب! سلطان یہاں سے سویرے سویرے چلا گیا ہے۔ وہ آپ کو قطب مینار کی اونچائی پر مل سکتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہاں پر وہ آنکھیں کھول کر ہندوستان کا نظارہ اُٹھا رہا ہے یا آنکھیں بند کر کے خودکشی کر رہا ہے۔ آپ وہاں جا کر دیکھ لیجئے

میں اپنا بیان ختم کرتا ہوں

❀❀❀

ساجھے داری

ڈھلتی رات کے مہیب اور تاریک سناٹے میں ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ انتہائی سکوت میں کہیں کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گپ گنگا روڑ کے اگلے موڑ پر دو منزلہ مکان کے قریب ایک آدمی جو زیادہ تنومند بھی نہ تھا رات کے اس اندھیرے میں اپنے آپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ یکایک اس کے کانوں میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ اس آہٹ کا انتظار ہونے کے باوجود بھی دفعتاً اس کے چہرے کا رنگ فق سا ہوا۔ دل دھک دھک کرنے لگا لیکن جمال کو اپنے سامنے دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور بے صبری سے پوچھا:

''جمال! تم ہو، بتاؤ کیا دیکھا تم نے؟''

''میں نے دیکھا، مکان کے برامدے پر کتنا لیٹا ہوا ہے۔ رسوائی میں لائٹ آن ہے شاید ان کا نوکر وہاں لیٹا ہو گا''

''تو کیا وہ اب تک بیدار ہے''؟

''رمیش نے اس انداز سے پوچھا گویا وہ جمال کو کہہ رہا تھا کہ اگر وہ بیدار تھا تو تم نے اس کو ہمیشہ کی نیند کیوں نہ سلا دیا۔

جمال تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور بولا

''میرے خیال میں ہم گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بجائے کیوں نہ دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جائیں کیونکہ گیٹ سے اندر داخل ہو کر کتے کے بیدار ہونے کا احتمال ہے''۔

''کتا پھر بھی بیدار ہو سکتا ہے یار! اور گیٹ بھی تو کھلا ہی رہنا چاہیے''

''پہلے ہم اندر جانے میں کامیاب ہو جائیں، پھر گیٹ کھل سکتا ہے۔ آؤ تم میرے ساتھ''

جمال اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو دیوار کے سامنے لایا اور خود کمر جھکا کر ساتھی کو اس پر چڑھنے کا اشارہ کیا، رمیش ایک جست لگا کر اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ دوسرے لمحے وہ دیوار پر بیٹھ گیا اور ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اوپر کھینچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں احاطے میں آ کر آگے بڑھنے کی تیاری کر رہے تھے۔

دفعتاً کتا جاگ اُٹھا اور بھوں بھوں کر کے آسمان کی قلابیں ملانے لگا۔ کتے کے بھونکنے کے درمیان دونوں ساتھی گھٹنوں کے بل چل کر پیچھے دروازے کے پاس آئے اور اس کے ساتھ کھنچا تانی کرنے لگے جب اس طرح دروازے نے کھلنے کا نام نہیں لیا تو جمال نے تھیلے میں سے ایک آواز نکالا جس کے سرے پر ہینڈل سا لگا تھا۔ اس اوزار کو دروازہ کے شگاف میں سے اندر ٹھونس کر اس کو کنڈے کے سوراخ میں پھنسا دیا اور ہینڈل کو دس ایک بار گھمایا کہ کنڈا نیچے گر گیا۔ کنڈے کے نیچے گرنے کی صدا سنتے ہی اُن کے چہروں سے ہوائیاں سی اڑنے لگیں اور دل جو پہلے ہی سے دھک دھک کر رہے تھے یکا یک اچھل سے گئے، ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے انہوں نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور آندر آ کر اس کو آدھ کے قریب بند کر دیا۔

انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں راہداری کا جائزہ لیا۔ جمال نے آگے بڑھ کر باہر نکلنے کا دروازہ جو اندر سے بند تھا اس کو کھول دیا اور پھر صحن کا گیٹ تھوڑا کھلا رکھ دیا تاکہ بھاگنے کا راستہ آسان رہے، اتنی دیر تک جب تک کہ جمال واپس آیا رمیش نے راہداری کا لیمپ ہولڈر سے نکال کر نیچے رکھ دیا تھا۔

اب ایک کے بعد ایک سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ کانوں میں دور سے آواز آتی، ایسا سنتے ہی دوں ٹھہر گئے اور تاریکی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر نہ جانے کیا بڑا بڑانے لگے۔

ہوشیار خبردار کی آوازیں اور کتوں کے بھونکنے کی صدائیں برابر آ رہی تھیں کہ یہ دونوں سیڑھیاں طے کر کے مکان کی دوسری منزل کی راہداری میں آ گئے۔ ان کے

سامنے جو دروازہ مقفل تھا اس کی طرف دیکھ کر رمیش نے ایسا اطمینان کا سانس لیا گویا دروازہ مقفل ہونا ان کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا اور جب تک جمال دوسرے کمروں کے دروازے دیکھ کر آیا رمیش نے اس کمرے کا قفل توڑ کر نیچے رکھ دیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ دروازہ کھول رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب دروازہ کھل گیا تو اندر آ کر انہوں نے اس کمرے کا جائزہ لیا اگرچہ کمرہ قیمتی سامان سے پُر تھا لیکن انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر غلط نقشے کا انکشاف کیا، تھوڑی دیر بعد وہ راہداری کے بائیں جانب کے دوسرے دروازے کی طرف متوجہ ہوئے جو کہ اندر سے بند تھا اور کھلنے سے صاف انکار کر رہا تھا اس دروازے پر وہ ایسے جم گئے گویا انہیں جس جگہ کی اطلاع دی گئی تھی وہ یہی کمرہ تھا دروازہ اندر سے بند ہونا انہیں کسی کے سونے کا پتہ دے رہا تھا۔ مگر انہیں کسی طرح بھی اندر جانا تھا اس لئے انہوں نے دو تین کمروں سے نئے پرانے کپڑے جمع کر کے لائے اور اس کمرے کے دیوار کے نیچے رکھ دیئے تا کہ وہ نقب لگا کر اندر گھس سکیں اور نقب لگاتے وقت جو ملبہ نیچے گرے وہ کپڑوں پر گر کر کوئی صدا نہ دے سکے...... اس طرح نقب لگاتے ہوئے انہیں تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دوسرے کمرے سے کھانسی کی آواز آئی یکا یک دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر نیچے پیروں پر بیٹھ گئے اور کھانسی کی آواز پر کان لگائے نہ جانے کونسا اندازہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر تک جب کھانسی بدستور چالو رہی تو انہوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے کی چٹکی لی اور جمال نے ناخونوں سے دروازے کو اس طرح کھرچنا شروع کیا گویا کوئی بلی اپنے پنجوں سے دروازہ کھول رہی ہے۔ لیکن جب اس طرح بھی کھانسی نہ رکی تو رمیش نے اپنے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر منہ کے ساتھ لگایا اور بلی کی طرح میاوں میاوں کرنے لگا...... باہر کتے بھوک رہے تھے اور سپاہی ہوشیار خبردار کی صدائیں لگاتے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ وقت برابر گزر رہا تھا۔

"ان سپاہیوں کو کیا ہوا، کیوں یہ رات کو شور مچاتے پھرتے ہیں؟" رمیش سرگوشی میں بولا۔

''ان کی تو ڈیوٹی یہی ہے''۔ جمال نے جواب دیا

''تو کیا ہم یہ ڈیوٹی انجام نہیں دے رہے ہیں۔ ہم بھی تو ان کے ساتھ حصہ مساوی میں یہ کڑی محنت کر رہے ہیں''۔

خیر کوئی بات نہیں''۔ میں ان کو اس کا مزا چکھا دوں گا۔ اب وہ پھر نقب لگانے لگے تھے کہ مالکن بیدار ہوئی، اس کے کانوں میں کھدر کھدر کی آواز آ رہی تھی، جس سے اس نے بلی کے ہونے کا اندازہ کیا اب جب کہ اُسے نقیب لگایا جانے کا شبہ ہوا تو گھبراہٹ میں وہ بے سدھ سی ہو گئی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھوڑی ہی دیر میں اس کے جسم سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ بیڈ سوئچ قریب ہونے کے باوجود بھی وہ لیمپ روشن کرنے کی جرأت نہیں کر سکی لیکن تھوڑی دیر بعد وہ گھٹنوں کے بل چل کر شوہر کے پاس آتی اور اسے چوروں کے بارے میں آہستہ آہستہ بتانے لگی۔

نقب کی آواز پر کان لگاتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں چہرے پر زردی سی پھیل گئی جسم کانپنے لگا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا:

''یہ چور...... چور...... تو ارجن بیٹے کے کمرے کی دیوار کو توڑ رہے ہیں۔ مگر کیا ارجن اور اس کی بیوی بیدار کیوں نہیں رہے ہیں......''۔

''وہ بیدار بھی ہو جائیں گے تو کیا کریں گے؟ ان کی موت جو سامنے کھڑی ہے''۔

''ہائے رام۔ ہائے رام۔ موت اُن کے دشمنوں کی کھڑی ہے، اب کیا ہوگا''۔

''ہوگا کیا......؟ اٹھو شور مچاؤ، سپاہیوں کو بلاؤ لوگوں کو بلاؤ''۔

جس طرح اس کمرے میں رام داس اور اس کی بیوی دوسروں کو جگانے کی فکر میں پریشان تھے اسی طرح ان کا بیٹا اور بہو موت کے خوف سے کانپ رہے تھے، چور برابر اپنا کام کر رہے تھے اور سپاہی ہوشیار خبردار پکارتے پھر رہے تھے۔

یک بار رندھے ہوئے گلے سے چہ...... چور...... چور بچاؤ کی آواز رات کے تاریک سناٹے میں دور دور تک پھیل گئی۔ چور گھبرا کر دم بخود ہو گئے اڑوسی پڑوسی جاگنے

لگے اور سپاہی دوڑ دوڑ کر آنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا جس میں پتہ بھی نہیں چلا کہ چور کون ہیں اور کون نہیں ہیں نیند سے بوجھل آنکھوں کو چکمہ دے کر جب دونوں چور ان کی نظروں کے سامنے بھاگ نکلے تو سبھوں نے مل کر دوڑتے بھاگتے اور شور مچاتے ہوئے ان کا تعاقب کیا۔

دونوں چور برق رفتاری سے جا رہے تھے اور لوگ برابر انکا تعاقب کر رہے تھے۔

اس طرح ایک راہ سے دوسری راہ، ایک گلی سے دوسری گلی سے گزرتے ہوئے جب چوروں نے ان کا اچھی طرح دھوکہ دیدیا تو سب لوگ مایوس ہو کر رہ گئے، ان میں سے کچھ لوگ واپس آنے لگے۔ صرف دو ڈاکو تھے جو ابھی دوڑ رہے تھے بھاگ رہے اپنی منزل کو من ہی من میں یاد کر رہے تھے اور، جب...... جب انہیں منزل کا سواد نظر آیا تو ان کی جان میں جان آئی اور وہ اطمینان کی لمبی لمبئ سانس لے کر آگے بڑھے پولیس اسٹیشن کے گیٹ پر اس وقت ایک سپاہی گشت لگا رہا تھا ڈاکوؤں نے اس سپاہی کو کوئی اشارہ کیا اور سیدھا اندر آ کر جب انہوں نے حوالات کے گیٹ پر پولیس کے چند آفیسروں اور سپاہیوں کو دیکھا تو انہوں نے اپنے بازو دراز کئے اور یک زبان ہو کر بولے: انسپکٹر صاحب حوالات کا دروازہ کھول دیجئے اور ہمیں گرفتار کر لیجئے۔

''کیوں کیا بات ہے''۔ قریب قریب سبھوں نے ان سے پوچھا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتے حوالات کا دروازہ کھل گیا اور وہ حوالات کے اندر اطمینان سے کھڑے ہو گئے جب باہر سے دروازہ مقفل ہو گیا تو انہوں نے لوہے کی سلاخوں سے جھانک کر سہمتے سہمتے کہہ دیا؛ آج ہم پکڑ لئے گئے تھے۔ یہ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہم وہاں سے چھوٹ آئے'' نہ جانے انسپکٹر ان سے کیا پوچھنے والا تھا اور نہ جانے وہ کیا جواب دیتے کہ احاطے سے باہر ایک پُر اسرار آواز آئی ''ہوشیار خبردار''

لوہا پگھلتا ہے

زندگی میں آج پہلی بار جب وہ نئی منزل کی طرف روانہ ہوا تو اس نے دیکھا ہوائیں شادمانی کے گیت گا رہی تھیں۔ آسمان کے بادل اس کے سواگت کو دوڑ آ رہے تھے۔ زمین کے ذرے ذرے اسے مبارک باد دے رہے تھے۔ فتح کے نشے میں اس کے سرشار قدم زمین پر پڑتے ہی نہیں تھے۔ خوشی غرور اور رشک اس پر یلغار کر رہا تھا۔ اس کی آرزو نکھر رہی تھی۔ چاہت پروان چڑھ رہی تھی اور جسم مسرت میں ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے چل رہا تھا اور......شاید وہ کہہ رہا تھا۔

"لوگو! مجھے راستہ چھوڑ دو اور اس سڑک کو خالی کرو جس پر میں اس وقت جا رہا ہوں تم شاید مجھ کو جانتے نہیں...... مگر تم مجھ کو جانو گے بھی کیسے؟ تم تو اتنے بھولے ہو کہ اس وقت اوپر سے جو برس رہی ہے اس کو تم بارش کہتے ہو، ارے نا سمجھو! یہ دودھ برس رہا ہے......دودھ، میں تمہیں کہہ رہا ہوں تم میرے اس راستے سے ہٹ جاؤ، اس راستے سے جس پر میں اس وقت چل رہا ہوں۔

تم شاید مجھ کو پہنچانتے نہیں...... مگر تم مجھے پہچانو گے بھی کیسے؟ تم تو اتنے انجان ہو کہ اس وقت بارش سے......نہیں میرا مطلب اس وقت کچی سڑک پر دودھ کے برسنے سے جو بن رہی ہے، کیا نام ہے اس کا؟"

"کیچڑ......!"

"دھت تیری کی، کیچڑ......ارے نادانو! یہ کیچڑ نہیں، یہ تو شہد ہے......شہد۔ کہتے ہیں جس جگہ دودھ اور شہد کے ساتھ پریاں ہوتی ہیں، وہ جگہ جنت کہلاتی ہے۔ دودھ سے تو میں اس وقت نہلایا جا رہا ہوں اور شہد پر سے گزر رہا ہوں۔ اب صرف ایک پری

کی کمی ہے۔ یہ کمی آج پوری ہو جائے گی تو پھر جنت ہونے میں کونسی کسر رہ گئی؟ لیکن تم ابھی سے جہنم کی آگ کے بجائے حسد کی آگ میں نہیں سلگنا ابھی مجھے یہ راستہ طے کرنا ہے۔ یہی راستہ جس پر میں جارہا ہوں۔ مگر تم مجھے جگہ چھوڑ دونا، آج تمہیں اس راستے پر چلنے کی کیا ضرورت تھی۔ کونسی مجبوری تھی۔ اس راستے کو آج میرے لئے بالکل خالی رکھنا تھا...... دیکھوایک بھی میری بات نہیں سنتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، پہنچنے دو مجھے جنت میں اور ملنے دو مجھے اپنی محبوبہ سے پھر میں تمہیں اس نافرمانی کا مزہ چکھاتا ہوں، اب بھی موقعہ ہے کہ تم اس راستے کو بالکل خالی کر کے چھوڑ دو تاکہ میں جلدی جلدی اس کے پاس پہنچ جاؤں، جس نے مجھے بلایا ہے۔ اگر آج میں اپنی محبوبہ کے پاس جارہا ہوں تو تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ آخر میرا بھی کوئی حق ہے اس دنیا میں محبت کرنے کا مجھے بھی ادھیکار ہے۔ میری بھی چاہت، آرزو اور تمنا ہے...... تم شاید مجھ پر باور نہیں کرتے مگر میں سچ کہہ رہا ہوں مجھے پہلی بار آج میری محبوبہ نے بلایا ہے۔ میری محبوبہ کو تم جانتے نہیں۔ وہ جنت کی ایک حور ہے۔ تم کو شاید میری باتوں پر یقین نہیں آتا، اگر نہیں آتا ہے تو میں اسی سے ان باتوں کی تصدیق کرواتا ہوں۔

یہ رہی میری محبوبہ، تم اسے اچھی طرح سے دیکھ لو اور میری قسمت پر رشک کرو، اب میں تمہارے سامنے اس سے پوچھ لیتا ہوں...... بتاؤ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے مجھے اپنے پاس بلایا ہے؟"

"ہاں میرے یار! میں نے آپ کو بلایا ہے آپ کے بغیر مجھے ایک ساعت چین نہیں آتا ہے۔ میرا دل صرف آپ کے نام سے دھڑکتا ہے"۔

"سچ......، مجھے تو یقین ہی نہیں آتا حالانکہ میں نے سبھوں کو بتایا ہے کہ ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ کیا کریں گے لوگوں کے سامنے اپنی مونچھیں کھڑا رکھنی پڑتی ہیں......، ذرا تم مجھے آہستہ سے بتاؤ تم مجھے کہاں جانتی ہو، میں نے تم کو ابھی پہچانا بھی نہیں"۔

"اتنی بھول...... کیا آپ نے میرے ساتھ "لوہا پگھلتا ہے" نامی ڈرامے میں کام

نہیں کیا ہے، آپ کو یاد ہوگا اس ڈرامے میں ایک لڑکی سے انتقال لیتے ہوئے میں کس طرح ایک شریف نوجوان کی زندگی برباد کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ دیکھنے والوں نے میری اداکاری پر شاباش دی تھی۔"

"اچھا یاد آ گیا۔ تم تو عشقیہ محبوبہ ہی نہیں بلکہ نام کی بھی محبوبہ ہو"۔

"ہاں وہی محبوبہ جسے کالج میں اکرم کے ساتھ محبت نام کی بدنامی ہوگئی تھی۔ اکرم آپ کے دوست ہیں مگر وہ مجھے بالکل پسند نہیں...... محبت اگر پسند کا نام ہے تو میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں مجھے صرف آپ پسند ہیں۔ مگر میں اب تک اپنی پسندیدگی کا اظہار آپ کے سامنے نہیں کرسکی۔ اگر آپ مجھ سے اس کی وجہ پوچھینگے تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں"۔

"کیوں......"؟ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی، کیونکہ تم نے مجھے اب تک غافل رکھا ہے"

"غافل میں نے نہیں بلکہ آپ نے اپنے آپ کو رکھا ہے......آپ جانتے نہیں۔ آپ کی یہ ناسمجھی مجھے مایوس اور ناامید کررہی تھی۔ نہ جانے میں کب تک اسی مایوسی اور ناامیدی میں سکڑتی رہتی۔ اگر میری چاہت کے مٹانے کے اسباب نہ کئے جاتے، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ کی یاد نے مجھے وارفتہ بنا دیا ہے۔ دن کو میں تمہارے تصور میں کھوئی رہتی ہوں اور رات کو......صرف تمہارے خواب دیکھتی ہوں۔ میں آج تک اپنے آپ پر کافی ظلم و جبر کررہی تھی۔ محض اس لئے کہ مجھے آپ کے سامنے اپنی چاہت واضح کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ میری ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ مگر اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ میں عام لڑکیوں سے ذرا مختلف ہوں۔ میں گناہ کو محبت کہنے سے قاصر ہوں۔ میں آبرو کی توہین کو عشق ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں عصمت لٹا کر محبت اور پیار کا کھیل کھیلنے کو عظیم پاپ سمجھتی ہوں"

"بہت خوب......، کیا خیالات ہیں تمہارے، میں تمہارے ان خیالات کی داد دیتا ہوں"

''میں یہ بھی نہیں چاہتی ہوں دو محبت کرنے والوں کو برا بھلا کہیں، اپنے اور پرائے ان کو ستائیں، سماج اور سوسائٹی ان پر ظلم کرے...... حقیقت میں انہی باتوں سے مجبور و لاچار ہو کر میں اپنی چاہت پر جبر کر رہی تھی۔ ایک طرف میرے دل میں تمہاری یاد تھی۔ دوسری طرف خاندان کی بدنامی کا پاس تھا۔ اور تیسری جانب ان سب باتوں کا حساس تھا۔ جو عشق میں ہوتی رہتی ہیں۔ جو پیار و محبت کا حاصل ہے۔ لیکن آج وقت نے مجھے جھنجھوڑا ہے اور حالات نے اکسایا ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ آپ مجھے سنبھالئے نہیں تو میں برباد ہو جاؤں گی''۔

''کہیں یہ کسی ڈرامے کی رہرسل تو نہیں ہے''۔ لوہا پگھلتا ہے'' میں تم نے ایسے ہی ڈائیلاگ کہے تھے۔ انہی ڈائیلاگ سے تم نے اُس ڈرامے میں ایک لوہے سے بھی سخت مرد کو پگھلایا تھا''

''آپ تو ایسا ہی سمجھیں گے۔ جب تک میں......''

''ایسا نہ کہو۔ تم میری ہو، تم میری ہو کر رہو گی''

''میرے یار! کوئی مجھے تم سے چھین رہا ہے۔ کیا تم مجھے اُس سے چھڑا سکتے ہیں''

''تم کو مجھ سے موت کا فرشتہ بھی نہیں چھین سکتا ہے۔ تم مجھ کو سمجھتی کیا ہو؟''

''مجھے تم پر پورا وشواس ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ نہیں تو ہم دونوں کو عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ تم جانتے نہیں میرے گھر میں آج کل صرف میری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں اس شادی کے خلاف ہوں اور اس کے لئے میں جہاد کرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ بشرطیکہ تم مجھے ساتھ دو گے''۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو، میں تمہارے لئے اپنی جان دے سکتا ہوں۔ تمہاری خاطر میں اس دنیا کو ٹھکرا سکتا ہوں''۔

''میرے یار! تم کو جان دینے کی یا دنیا ٹھکرانے کی ضرورت نہیں، صرف تم کو میری اُس راہ کو صاف کرنا ہے جس راہ پر سے چل کر میں تمہارے پاس آؤں گی''۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''تم نے میرے بغیر بھی کسی کو اپنایا ہے''

''اچھا سمجھ گیا......، مگر وہ میرا نہیں بلکہ میرے گھر والوں کا کام ہے، وہ کام میری مرضی کے خلاف ہوا ہے۔تمہارے بغیر میں اور کس کو اپنا سکتا ہوں''

''میں نے سنا ہے منگنی ہو چکی ہے۔اب شادی ہو رہی ہے''

''ہاں اس کے ساتھ شادی ہو رہی ہے جس کو میں نے اب تک دیکھا بھی نہیں ہے۔جس کے ساتھ میری کوئی چاہت ہی نہیں ہے۔تم کو معلوم نہیں میں پہلے بھی اس شادی کے خلاف تھا۔اور آج بھی ہوں''۔

''کیا تم یہ سچ کہہ رہے ہیں؟'' مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔شاید تم دل کی باتیں بتانے کے بجائے ''لوہا پگھلتا ہے'' ڈرامے کے ڈائیلاگ ادا کر رہے ہیں۔اُس ڈرامے میں تمہارے ایسے ہی ڈائیلاگ تھے نا''۔

''تم ڈرامے کی باتیں چھوڑ دو، اور مجھ پر باور کرو، مجھے غلط سمجھنے کی کوشش مت کرو۔''

''تو کیا تم مجھے یہ راستہ صاف کر کے دو گے''۔

''کل نہیں...... بلکہ آج''۔

''مجھے تم سے یہی توقع ہے میرے یار! اب میں کھلے بندوں اپنی شادی کے خلاف آواز اٹھاؤں گی''۔

''اور میں بھی آج ہی گھر جا کر انہیں کہدوں گا مجھے یہ شادی منظور نہیں ہے''۔

''وعدہ کرو!'' محبوبہ نے ہاتھ بڑھایا۔بشیر نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔کچھ دیر بعد دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے''۔

اب تو آپ کو یقین آیا ہوگا۔اور یہ بھی پتہ چلا ہوگا۔میں ایک ایسا عاشق ہوں۔جس کی کوئی معشوقہ بھی ہے۔جو مجھ پر جی جان سے قربان ہو رہی ہے۔اب تم ہی بتاؤں

کون ہے وہ جو مجھ جیسا خوش نصیب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے بارے میں باتیں بنارہے ہو مگر میں تمہیں صاف طور پر کہے دیتا ہوں۔ جو جس کے جی میں آئے کرے، مجھے اب کسی کی بھی پرواہ نہیں...... کہدو کہ میری نس نس میں عورت انہی دنوں سوار ہو چکی تھی۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ کالج کے کئی لڑکوں اور لڑکیوں کو آپس میں محبت کرتے دیکھ کر رشک وحسد کی آگ میں جلتا تھا۔ اور دوسروں کی عشقیہ کہانیاں سُن سُن کر پیچ وتاب کھاتا تھا۔ فیشن پرستی میں، باپ کی کمائی لٹاتا تھا...... کہدو کہ میرے ذہن پر عورت بری طرح سوار ہونے کی وجہ سے ہی میں کہیں کا بھی نہیں رہا تھا۔ اور یہ بھی کہدو کہ کالج سے نکل کر ملازمت کرنے کے بعد بھی میرے معمولات اور خیالات میں خاص کوئی فرق نہیں آیا۔ تو میرے والدین میرے بارے میں روز روز نت نئی باتیں سن کر سخت تنگ آ گئے یہاں تک کہ انہوں نے ایک لڑکی کو پوری طرح مجھ پر سوار کیا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک لڑکی کے ساتھ میری منگنی ہو گئی ہے اور میں اب اس بات پر مطمئن تھا کہ کوئی لڑکی میری ہو رہی ہے اور دیر سویر مجھے بھی کسی لڑکی کی قربت نصیب ہو گی۔

اس کے باوجود بھی مجھے اس بات کا بہت دکھ تھا۔ کاش ! میری بھی کوئی معشوقہ ہوتی۔ اور اگر ایسا ہوتا تو میں بھی دوسروں کی طرح اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا، اس کے ساتھ پک نک کو جاتا کسی ہوٹل میں اس کو اپنے سامنے بٹھا کر اس کے ساتھ چائے نوش فرماتا، سنیما میں اس کے ساتھ پکچر دیکھتا، بازاروں میں اس کے ساتھ قدم ملا کر چلتا اور تنہائی میں اس کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں میٹھی میٹھی باتیں کرتا،......اس کے نرم ونازک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ملتا، اس کی مخمور آنکھوں میں اپنی پیاسی آنکھیں ڈال دیتا اور پھر ہماری محبت کا چرچا ہوتا...... میں کتنا شاد ہو جاتا، لوگ مجھ پر رشک کرتے میرے ساتھیوں کو میری طرف دیکھ کر جلن ہوتی......،

دیکھو تم مجھے طعنہ نہ دو میں مانتا ہوں کہ میرا یہ خوب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا جس کی وجہ سے میرے جذباتی سوتے خشک ہو گئے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اپنے مقصد میں ناکام ہو کر

میں عشق و محبت کو بیہودگی جان کر صرف اس امید پر جی رہا تھا۔ آج نہ کل میری شادی ہوگی اور شادی ہو جانے کے بعد میں اپنی چاہت، آرزو اور ارمان پروان چڑھاؤں گا۔ میں اپنی بیوی کو محبوبہ بن جانے کے لئے کہوں گا اور...... اسی دوران اگر آج پہلی بار کوئی میری محبوبہ بن کر مجھے یاد کر رہی ہے۔ تو تمہیں جلن کیوں ہوتی ہے۔ تم اُس وقت میری راہ میں حائل کیوں ہوتے تھے۔ جب میں اپنی محبوبہ کے پاس جا رہا تھا اور اس وقت آپ میرا تماشہ کیوں دیکھتے ہیں۔ جبکہ میں گھر میں اُس شادی کے خلاف احتجاج کر رہا ہوں جو میری مرضی کے خلاف ہو رہی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایسے وقت میں جبکہ دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرے انکار سے ایک کہرام سا مچ رہا ہے۔ میرا باپ غم و غصے سے برہم ہو رہا ہے۔ میری ماں اس انکار کو ایک حادثہ سے تعبیر کر رہی ہے۔ میرے بہن بھائی میری اس حرکت پر سخت ناراض ہو رہے ہیں مگر میں مجبور ہوں، اور آپ کو میری مجبوری کے ساتھ پوری ہمدردی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ کو میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تو مجھے آپ لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آپ لوگوں کی ہمدردی کے بغیر بھی کہہ سکتا ہوں "مجھے یہ شادی منظور نہیں ہے...... میں شادی کروں گا تو اپنی مرضی سے کروں گا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا" دیکھئے یہ میرا باپ کہہ رہا ہے۔ "ایسا کہتے ہوئے تم میری پگڑی اچھال رہے ہو تم ہماری توہین کر رہے ہو"۔

"آپ بھی میری چاہت کا گلہ گھونٹ رہے ہیں"۔

"کس چاہت کا؟ تمہاری چاہت کیا ہے؟!"

"مجھے اپنی مرضی سے شادی کرنے کی چاہت ہے"۔

"لیکن یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتا دی، یہ کام ہم نے تم سے پوچھ کر کیا ہے۔ نکاح کے وقت تم نے اس کا اقرار کیا ہے"۔

"اُس وقت میرا یہی خیال تھا لیکن اب میرا خیال بدل گیا ہے"۔

"تمہارا خیال تم کو برباد کر دے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم کسی ریوڑی کے پھیر

میں آگئے ہو، یاد رکھو تم نے ایسی کوئی حرکت کی جو ہماری مرضی کے خلاف ہوگی تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ اب بھی موقعہ ہے کہ تم ان حرکتوں سے باز آؤ۔"

"میں ایک بار کہہ چکا ہوں یہ شادی نہیں ہو سکتی......نہیں ہوگی"۔

"اگر یہ شادی نہیں ہو سکتی تو پھر تم بھی ہمارے نہیں ہو سکتے، اس بات کو نوٹ کرلو۔"

"میں یہ قدم اٹھانے سے پہلے ہی اس بات کو نوٹ کر چکا ہوں"۔

"گویا یہ پلان تم نے پہلے ہی بنا رکھا ہے......اگر تمہارا یہی ارادہ ہے۔ تو پھر تم یہاں سے جا سکتے ہو"۔

"اپنی چاہت کے لئے میں اس دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں اس گھر بار کی بات ہی نہیں"۔

"......چلے جاؤ، اس گھر میں کبھی قدم رکھا تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ ڈالوں گا"۔

"آپ کو ایسا کرنے کی نوبت نہیں آئے گی......میں جا رہا ہوں اور آج ہی اس کا فیصلہ کر رہا ہوں"۔

آپ تو دیکھ رہے ہیں کہ میں کس انداز سے جا رہا ہوں اور پیچھے سے میری ماں مجھے کس طرح بلا رہی ہے۔ میری بہن کس طرح میرے لئے رو رہی ہے۔ میرا باپ اور بھائی میرے لئے کیسے پچھتا رہے ہیں۔ مگر مجھے اس وقت پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے بلکہ سب کچھ بھول کر آگے بڑھنا چاہئے۔

میں آگے بڑھ رہا ہوں......نہ جانے کہاں اور کدھر؟؟

دیکھئے محبت کی کشش مجھے اپنی محبوبہ کے پاس کھینچ لے آئی۔ آپ دیکھ رہے ہیں میری حالت اس وقت قابل رحم ہے۔

میری محبوبہ نے میری یہ حالت دیکھی تو اس کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ لیکن اپنی کوئی پراہ کئے بغیر دیکھئے کسطرح اس نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور میری اس حالت کے بارے میں دریافت کیا۔

میں اسے سب کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ مگر میری حالت...... میری محبوبہ نے اگر میری ڈھارس بندھائی تو میں اسے کیوں نہ کہہ دوں......"

محبوبہ! مجھے سہارا دو، میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہیں؟

"وہی جو تم سُن رہی ہو، میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے تمہارے لئے سبھوں کو چھوڑ دیا ہے۔ تم بھی سب کچھ چھوڑ کر میرے پاس آؤ ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے"۔

"آج تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ تم کو کیا ہو گیا ہے؟!"

"جو ہونا تھا وہی ہوا .....تم صرف یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"کس بارے میں؟"

"احتجاج کے بارے میں؟"

"وہ میں کروں گی ضرور کروں گی۔ جب وہ وقت آن پہنچے گا"۔

"وہ وقت تو آن پہنچا ہے۔ اب دیر نہ کرو، میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں"۔

"کیا اُس......اس کو بھی چھوڑ دیا؟"

"ہاں اس کو میں نے ابھی ابھی طلاق بھیجدیا ہے۔"

"سچ......؟"

"کیا تمہارے سامنے کبھی میں جھوٹ بولوں گا......" "یہ دیکھو؟"

محبوبہ نے طلاق نامے کی نقل دیکھی تو اس کا رنگ ہی تبدیل ہو گیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی......میں فوراً بولا۔"

میں تمہاری راہ کو صاف کر چکا ہوں۔ آؤ اس راہ پر چل کر ہم اس منزل پر پہنچ جائیں گے۔ جہاں ہمیں جانا ہے جہاں ہم ہوں گے ہماری دنیا ہوگی۔ جہاں ہماری محبت پروان چڑھے گی"

"بشیر! منزلوں کی باتیں اب چھوڑ دو یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

"کونسا کھیل محبوبہ......!" میں بھونچکا سارہ گیا۔ اس نے کہا

"وہی کھیل جو میں تمہارے ساتھ کھیل چکی ہوں۔ اور جس کام کے لئے کھیل چکی ہوں۔ وہ کام تم نے پورا کر کے دکھایا"۔

"محبوبہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یہ سب ڈائیلاگ اُس ڈرامے کے ہیں۔ اس وقت ہم ڈرامے کی نہیں بلکہ حقیقت کی باتیں کر رہے ہیں"۔

"تم کھیل کو ڈرامہ سمجھ رہے ہو۔ اور میں ڈرامے کو حقیقت اس لئے کہ "لوہا پگھلتا ہے"۔ نے بہت کچھ سکھا دیا ہے......تم میری باتوں کو نہیں سمجھو گے......ہاں اگر کبھی تمہیں اس کے ساتھ صلح ہو جائے جو تمہاری ہونے والی بیوی تھی تو تم اس کو میری طرف سے کہہ دینا کبھی تم نے محبوبہ کے ساتھ لڑ کر اسے بھرے بازار میں بدنام کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس کے ساتھ لڑنا اپنی بربادی کو دعوت دینے کے برابر ہے......دیکھئے بھولنا نہیں"۔ اتنا کہہ کر محبوبہ اٹھ کر چل دی۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ مگر آپ میری طرف مت دیکھئے۔

❀❀❀

بہت اونچے، بہت نیچے

آپ کو میں یہ خط نہایت ہی رنج و افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ یقین کیجئے ہمارا ہوس بوٹ اس وقت ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ آپ یہاں ہوتے تو ہماری حالت دیکھتے، کاش؛ اس امانت کے بدلے میری جان چلی گئی ہوتی۔ میں آپ لوگوں کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکا۔ اس کے لئے میں اب آپ لوگوں کو اپنا یہ ذلیل منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ آپ انسان کے روپ میں فرشتے ہیں۔ وہ نیک فرشتے جنہوں نے میری اجڑی نگری بسائی تھی۔ میری حیثیت کی کایا پلٹ دی تھی۔ اس کے صلے میں مجھے آپ کی امانت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرنی تھی۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکا...... اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔

کل رات کو گڈ لک GoodLuck ہوس بوٹ میں ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈال کر بہت سا قیمتی سامان اور امانت کا بکس لوٹ لیا۔ میں نے پولیس میں اطلاع دی ہے تا کہ اس کا کھوج نکلے۔ جونہی مجھے اس کا کچھ پتہ چلے گا میں فوراً آپ کو مطلع کروں گا۔

بدنصیب......رمضان

۱۵ ستمبر ۱۹۴۶

یہ خط پوسٹ کر کے جب رمضان اپنے بوٹ میں آیا تو اس کا رواں رواں انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ اس کا ذہن تذبذب کا شکار ہو رہا تھا۔ ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا...... اور اسی کیفیت میں وہ خدا سے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ جس طرح اس کے چہرے پر رنج و غم کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اسی طرح خوشی اور مسرت کی انتہا بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی...... وہ ایک دم کھڑا

ہوااور آگے بڑھا۔

ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ وہ رُک گیااور سوچنے لگا...... "کیا میں پولیس کو یہ اطلاع دوں؟ پھر تو مجھے ہوس بوٹ کا قیمتی سامان اور امانت کا بکس کسی محفوظ جگہ لینا پڑے گا"۔

اُس نے گڈلک ہوس بوٹ کے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولدیا۔ اور اندر آکر وہ صوفہ پر دراز ہوگیا۔ اس نے اس الماری کی طرف کنکھیوں سے دیکھا جس میں امانت کا بکس تھا......دفعتاً اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اس کے ذہن میں سولہ......نو......پچیس کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس نے پہلو بدلا تو اس کی نظر جان رابرٹ اور اس کی مسز تصویر پر پڑی۔ "دو نیک فرشتے......!" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ مسکراہٹ اس کے سامنے ایک کہانی لے آئی۔ جو آج سے چند ماہ قبل اسی ہوس بوٹ کے اسی ڈرائینگ روم میں شروع ہو کر انڈین ائیر لائنس کے احاطہ میں ختم ہوئی تھی۔ رمضان نے ایک بار اور جان رابرٹ اور اس کی بیوی کی تصویر کو دیکھا...... بلجیم کے یہ دو وزیٹر رمضان کے گڈلک ہوس بوٹ میں متواتر دس سال سے آرہے تھے اور ایک دو مہینے ٹھہر کر واپس جاتے تھے۔ لیکن اس سال وہ پورے چار ماہ یہاں گذار کر گئے تھے ان چار مہینوں میں انہوں نے رمضان کی دُنیا ہی بدل دی تھی۔ اُسے یاد آ گیا...... آج سے چند ماہ قبل وہ بازار سے سودا سلف لے کر گڈلک میں آیا تھا تو صاحب نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا تھا اور انگریزی میں کہا تھا "تم اس وقت تک کہاں تھے تُم نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ تُم نے یہ کیا مخول سمجھ رکھا ہے؟"

رمضان صاحب کے رویے کو دیکھ کر متحیر ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا صاحب نے غصیلے لہجے میں کہا تھا "کھڑے کھڑے یہاں کیا کر رہے ہو، چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہاری بوٹیاں نوچ لوں گا"۔

رمضان سٹ پٹا گیا تھا۔ بیگم کی مداخلت کے باوجود بھی صاحب نے اسے دھکیلتے

ہوئے یہاں سے نکال دیا تھا۔ بیگم اس کے پاس آ کر نرمی سے بولی تھی" رمضانا! یہ تم کیا کر رہے ہو، اٹھو کرو اپنا کام، پتہ نہیں صاحب کو آج کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ یہ تم کو بھی معلوم ہے۔ تم اس کو کچھ نہ کہنا۔ اسے اندر سے گالی نہیں دینا۔"

رمضان گلو گیر آواز میں بولا تھا"۔ میں نے صاحب کو کیا کہا کہ اس نے مجھے اس طرح پیٹا، آج تک کسی بھی وزیٹر نے مجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھایا ہے"۔

"میں صاحب کو سمجھا دوں گی۔ اٹھو تُم کرو اپنا کام......، اور قسم کھا کر کہدو کہ میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ گالی نہیں دوں گا۔" اتنا کہہ کر اس نے پرس سے پانچ سو روپے نکال کر رمضان کو دیئے تھے اور آہستہ سے بولی تھی۔

"لو یہ میں تم کو دیتی ہوں۔ تُم صاحب کو نہیں کہنا، اٹھو کرو اپنا کام"

بیگم کے واپس جاتے ہی وہ ان سب نوٹوں کو حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مجھے اتنی بڑی رقم کیوں دی گئی۔ کسی کے پیٹھ پیچھے کیا کچھ نہیں کہا جاتا۔ اگر میں صاحب کو اپنی جگہ بُرا بھلا بھی کہدیتا اور گالیاں بھی دیتا تو بیگم کو کیا فرق پڑتا جبکہ وہ سنتی ہی نہیں، اس واقع کے بعد رمضان بیگم کے سامنے اپنے آپ کو صاحب کے ہاتھوں پیٹوانے کے لئے کتنی غلطیاں کرنے لگا تھا۔ مگر صاحب اس کی غلطیوں کو اس طرح ٹال دیتا تھا۔ گویا رمضان اس کے سامنے تین بچوں کا باپ نہیں بلکہ ایک چھوٹا بچہ تھا...... ایک روز رمضان چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا تو اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو صاحب کے سامنے نیچے گرا دیا، گویا اسے ٹھوکر لگی تھی۔ صاحب اس وقت ایک کچھ لکھ رہا تھا۔ ٹی سٹ کے گرنے سے چائے اور دودھ کی چھینٹیں اس کے کپڑوں اور کاغذات کو خراب کر گئی تھیں۔ صاحب نے اُٹھ کر رمضان کو کھڑا کیا تھا۔ اور دلاسہ دے کر بولا تھا" کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"

رمضان صاحب کے اس ہمدردانہ رویے کو دیکھ کر کچھ مکدر ہوا تھا۔ وہ حربے کو ناکام ہوتے دیکھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا کہ بیگم ڈانٹتے ہوئے بولی تھی" تم دیکھ کر کیوں

نہیں چلتے، صاحب کے کپڑے خراب کردیئے نان سنس!"

"بیگم! اسے کچھ نہ کہو، بے چارے کو ٹھوکر لگی ہے"۔ صاحب نے کہا تھا۔ بیگم غصہ ہوکر بولی تھی۔

"یہی بے چارہ کہہ کر آپ نے اسے سر پر چڑھایا ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ رمضان کی طرف بولی تھی۔

"اٹھاؤ یہ برتن اور چلے جاؤ یہاں سے......نان سنس!"

بیگم کے غصہ کو دیکھ کر صاحب رمضان کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچن میں لے آیا تھا اور بولا تھا "رمضان! تم ناراض نہیں ہونا۔ پتہ نہیں بیگم کو آج کیا ہو گیا ہے، پہلے تو وہ ایسا نہیں کرتی تھی۔ تم کو بھی معلوم ہے......، دیکھو تم اس کو بُرا بھلا مت کہنا۔ تم اس کو اندر سے گالی بھی نہیں دینا......، میں اسے سمجھاؤں گا"۔

"صاحب میں کسی کو گالی نہیں دیتا"۔ اس نے متاسفانہ انداز سے کہا تھا "یہ بیگم صاحبہ کا قصور نہیں۔ ہم غریبوں کو سب مارتے ہیں"

"ایسا مت کہو رمضانا۔ اگر تم غریب ہے تو تم نے ہم کو کیوں نہیں بتایا......، لو میں تم کو یہ پانچ سو روپے دیتا ہوں۔ تُم بیگم کو نہیں کہنا.....شاباش!"

پانچ سو روپے پکڑنے کے لئے رمضان اس طرح کھڑا ہوا تھا۔ گویا اپنے کسی کارنامے کا وہ ایک منسٹر سے ایوارڈ پا رہا تھا۔

صاحب کے واپس جاتے ہی وہ جلدی جلدی اپنے بوٹ میں آیا تھا۔ اور بیوی بچوں کو یہ سارے روپے دکھا کر خوشی سے ناچنے لگا تھا۔ رمضان کی خوشی و مسرت کو دیکھ کر اس کی بوڑھی ماں اور بیوی وزیٹروں کے ہاتھوں رمضان کو ٹپوانے کی دعائیں خدا سے مانگنے لگی تھیں......اِدھر یہ دونوں خدا سے ایسی دعائیں مانگ رہے تھے اُدھر رمضان اپنی جانب سے کسی غلطی کے سرزد ہونے کے لئے سرگرداں رہا جس غلطی کے عوض اس کی مار پیٹ ہو جائے۔ حالانکہ دانستہ نادانستہ طور پر وہ دن میں کئی کئی بار غلطیوں کا مرتکب بن رہا تھا۔ لیکن

ایسی کوئی غلطی نہیں ہورہی تھی جو اس کو پچواتی۔

رمضان کے سامنے یہ معمہ حل نہیں ہوتا تھا کہ میری اس طرح ڈانٹ پھٹکار کیوں ہورہی ہے اور پھر اس ڈانٹ پھٹکار کا معاوضہ کیوں دیا جاتا ہے۔اب اگر کچھ دیا جاتا ہے تو صاحب کیوں کہتا ہے بیگم کو نہیں کہنا۔اور بیگم کیوں کہتی ہے صاحب کو نہیں بتانا......، آج تک تو یہاں آتے رہتے ان کو پورے دس برس ہوگئے۔ان دس برسوں میں انہوں نے میرے ساتھ کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا۔اور نہ ہی یہ بڑی بڑی رقمیں بطور انعام یا ڈانٹ پھٹکار کا معاوضہ دیا تھا...... کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں ہے...... خیر جو کچھ بھی ہوگا مجھے کیا، مجھے تو روپے ملنے چاہئے، چاہئے وہ ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ہی کیوں نہ ملیں۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے ان کے آملیٹ میں زیادہ نمک ڈالا تھا۔جن کو چکھتے ہی انہوں نے دونوں پلیٹ جھیل میں پھینک دیئے تھے اور رمضان کی ایسی پھٹکار کی تھی کہ اگر روپے کا معاملہ درمیان میں نہیں ہوتا تو رمضان یہاں سے چلا گیا ہوتا۔وہ رمضان کو دوسرے آملیٹ لے آنے کے لئے کہہ رہے تھے۔لیکن رمضان اس حربے کو ناکام ہوتے دیکھ کر مبہوت کھڑا انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔رمضان کی اس حرکت پر دونوں کو سخت غصہ ہوا تھا۔اور یہ غصہ جب تک رمضان نے اپنے اوپر فرد نہیں کردایا تب تک وہ ایک قدم بھی وہاں سے نہیں ہٹا تھا۔

گڈلک میں یہ شور ہوتے ہی قریب کے بوٹ میں مسرت کی لہر سی دوڑنے لگی تھی۔اور مزید پانچ سو روپے کا حساب جمع ہونے لگا تھا۔رمضان نے سوانگ بھر کر جب واویلا کرنا شروع کیا تو دونوں نے غصہ تھوک کر اس کی منت زاری کی تھی۔اس سے معافی بھی مانگ لی تھی...... غرض وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جس سے کہ رمضان انہیں معاف نہ کرتا۔مگر اسے منت سماجت اور معافی کے بجائے مزید ڈانٹ پھٹکار کی ضرورت تھی۔جس کے بعد اسے روپے مل جاتے۔اس غرض کے لئے رمضان نے تب تک واویلا جاری رکھا تھا۔جب تک کہ صاحب نے اسے پانچ سو روپے اور بیگم نے

پانچ سو روپے نہیں دیئے۔ اس طرح ایک ہزار روپے لے کر وہ اپنے بوٹ میں آیا تھا اور بوڑھی ماں، بیوی اور بچوں کو اس بڑی رقم کے ملنے کی بشارت دے گیا تھا۔

اس واقع کو ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ رمضان نے ایک روز ان کے لنچ میں جان بوجھ کر کافی دیر لگا دی تھی تا کہ صاحب اور میم اس پر برس پڑیں۔ اور پھر پرس کھولیں۔ مگر دیہ دونوں روٹھ کر بغیر لنچ کے چلے گئے تھے جس کا بُرا اثر نہ صرف رمضان کی ذات پر پڑا تھا۔ بلکہ اس کی بوڑھی ماں، بیوی اور بچے بھی اس زد میں آکر پچھتانے اور ایک دوسرے کو بر بھلا کہنے لگے تھے۔ وزیٹروں کے روٹھ کر جانے کا الزام رمضان بیوی پر ڈال دیتا تھا۔ مگر اس کی بیوی اپنی ساس کو اس کا قصوروار گردانتی تھی۔ بوڑھی ماں رمضان سے شکایت کرتی تھی تم نے اُن کی شرافت اور نیکی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا اور رمضان اُن پر یہ الزام لگا رہا تھا کہ ایسا کرنے کے لئے تو تم نے ہی میرے کان بھر دیئے۔ اگر میں تمہاری باتوں میں نہیں آتا اور زیادہ لالچ نہیں کرتا تو وہ یہاں سے اس طرح روٹھ کر نہیں جاتے۔

اس طرح ایک دوسرے پر اس کی ذمہ داری ڈال کر، ایک دوسرے کو اس کا موردِ الزام ٹھہرا کر جب یہاں تو تو میں میں کے بعد گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی تھی تو دونوں وزیٹروں کی آمد نے ماتم کدہ کو عشرت کدہ بنا دیا تھا۔

ڈرائینگ روم میں آتے ہی جب انہوں نے رمضان سے اس شور وشرابے کے بارے میں پوچھا تھا۔ تو رمضان شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ انہیں میں جواب دوں تو کیا......؟ دونوں نے رمضان کو تسلی دی تھی۔ اور یہ ماجرا کہنے کے لئے اصرار کیا تھا۔ رمضان کو اچانک ایک بات سوجھی تھی اور وہ فوراً تیور بدل کر پریشان انداز سے بولا تھا" جناب! آپ نے جو دو ہزار روپے مجھے دیے تھے ان کو میں بنک میں جمع کرنے جا رہا تھا کہ وہ مجھے راستے میں کھو گئے......اسی بات پر ہم سب پچھتا رہے ہیں۔"

ایسا سُنتے ہی دونوں کو سخت افسوس ہوا تھا۔ اور تھوڑی دیر تک پچھتانے کے بعد

انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے اسے کہہ دیا تھا

''رمضانا! ہم کل بنک میں تمہارے نام خود ہی دو ہزار روپے جمع کرتے ہیں۔ تم جا کران کو کہد و اب وہ رونا پچھتانا چھوڑ دیں۔

ایسا سُن کر رمضان یہاں سے بے سروسامان مسافر کی طرح نکلا تھا۔ لیکن دوسرے بوٹ میں آتے ہی وہ خوشیاں منانے لگا تھا۔

دوسرے روز رمضان کے نام دو ہزار ڈالر جمع کرنے کے بعد دونوں نے سیر وسیاحت کا پروگرام بنایا تھا۔ اور تقریباً تین ماہ انہوں نے وادی کے تمام صحت افزا مقامات میں گزارے تھے۔ اگرچہ اس سیاحت میں رمضان ان کے ساتھ ایک کتاب کے تین باب بن کر رہا تھا۔ لیکن اس مدت میں کوئی ایسا واقع پیش نہیں آیا تھا۔ جس واقعہ میں رمضان کی ڈانٹ پھٹکار ہوتی۔ اور اس کے عوض اسے سینکڑوں روپے مل جاتے حالانکہ اس سفر کے دوران رمضان نے اپنی طرف سے بے شمار غلطیاں کی تھیں۔ مگر انہوں نے ہر بار اس طرح ٹال دیا تھا۔ جس سے رمضان کو روپے کے بجائے ندامت ملی تھی۔

سیر وسیاحت کے بعد جب وہ واپس گڈلک میں آئے تھے تو رمضان کتنے دنوں تک اپنے آپ کو پٹوانے میں مصروف رہا۔ کتنے حربے وہ اس کے لئے استعمال کر چکا تھا۔ لیکن جب کوئی بھی حربہ کارگر نہیں ہوا تو ان دونوں نے اس کی حرکات کو دیکھ کر اسے اپنے پاس بلایا تھا اور اسے اپنی روانگی کی اطلاع دے کر پورے ۲۰ ہزار روپے کے ساتھ ایک فہرست بھی دی تھی جس میں گڈلک کے لئے مزید فرنیچر۔ نئے قالین اور پردے اور دیگر ضروری سامان درج تھا۔ رمضان نے ۱۰ ہزار روپے کے قریب یہ سب سامان لایا تھا۔ اور باقی رقم بغیر کسی حساب کے اسے بچت کھاتے میں ڈالے تھے۔

دوسرے روز انہوں نے رمضان کو انڈین ائیر لائینس کے آفس تک اپنے ساتھ لیا تھا۔ جہاں وہ اس سے رخصت ہونے سے پہلے ایک چابی دے کر بولے تھے۔

"رمضانا ہم نے تمہاری الماری میں ایک بکس رکھدیا ہے۔ یہ اسی کی چابی ہے۔ اس بکس کو تم حفاظت سے رکھنا وہ تمہارے پاس ہماری امانت ہے۔ اس کے بارے میں ضروری ہدایات ہم اپنے وطن پہنچ کر بھیجدیں گے"۔

رمضان کو اس امانت کو دیکھنے کا بہت اشتیاق جب پریشان کرنے لگا۔ تو ایک روز اس نے الماری میں اس بکس کو نکال ہی دیا۔ اور پھر اس کا قفل کھول کر اسے دیکھا تھا بکس کا ڈکنہ اٹھاتے ہی ڈالر دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے سے سرخ لہریں سی اُٹھنے لگی تھیں۔ اس کا بدن کانپنے لگا تھا۔ وہ ڈر اور خوف سے کانپ بھی رہا تھا اور خوشی ومسرت سے باغ باغ بھی ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم کھڑا ہوا تھا" اور اس روم کا دروازہ بند کر کے ساتھ والے بوٹ میں آیا تھا اور غلطان وپیچاں ہو کر بوڑھی ماں اور بیوی سے مخاطب ہوا تھا"...... تُم کھڑی کیا دیکھ رہی ہو، جاؤ خدا سے دعا مانگو صاحب اور میم اب دوبارہ یہاں نہ آئیں۔ وہ بھی ہمیشہ کے لئے......، تم آستانوں پر جا کر منت زاری کرو، دونوں کہیں مرجائیں، لیکن جب اس طرح بھی اسے اطمینان نہیں ہوا تھا تو اس نے ان کے نام خط لکھنا ہی مناسب سمجھا جس میں انہیں امانت کے بکس کے چوری ہونے کی اطلاع دی تھی۔

اس خط کو پوسٹ کرنے کے بعد وہ گڈلک ہوس بوٹ کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا اس سوچ میں ڈوبا تھا کہ میں اس قیمتی سامان اور امانت کے بکس کو کہاں لے کر چھپادوں گا کہ اسے ایک خط موصول ہوا۔

ڈیر...... رمضانا!

ہم یہاں ٹھیک طرح سے پہنچ گئے۔ اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے، تم کتنے نیک اور بھولے ہو۔ ہم نے تمہارے پاس جو امانت کا بکس رکھدیا ہے۔ اس میں تین ہزار ڈالر ہیں۔ اس لئے اس کی طرف لاپرواہی نہیں برتنا۔ ہم نے تمہارے پاس جو یہ امانت رکھدی ہے۔ اصل میں یہ امانت تمہاری

ہمارے پاس تھی۔ آپ کی امانت جو ہمارے پاس تھی اور جو لاٹری کا ٹکٹ تمہارے نام سے ہمارے یہاں نکلی تھی وہ پانچ ہزار ڈالر کی تھی۔ تمہاری شادمرگی کو مدنظر رکھ کر یہ رقم ہم نے تمہیں دھیرے دھیرے لوٹا دی اور وہ بھی تمہارے ساتھ بدسلوکی کر کے۔ اس میں ہماری حکمت عملی تھی۔

اچھا، خوش رہو، آباد رہو، پھر ملیں گے

آپ کا اپنا

جان رابرٹ و مسز رابرٹ

چیونٹی کے پر

انتظار میں بے چینی اور بے قراری کی کیفیت جھلک رہی تھی۔ مگر اس بے چینی اور بے قراری سے پیار یا خلوص وابستہ نہ تھا، بس نفرت ہی نفرت تھی..... نفرت اور انتقام۔

مگر تم صرف نفرت کر سکتی تھیں، انتقام نہیں لے سکتی...... اس لئے کہ تم بسترِ مرگ پر پڑی زندگی کے اس چراغ کو بجھتے دیکھ رہی تھیں جو تمہارے سامنے ٹمٹما رہا تھا...... کیا تم اپنے دل پر، جو تمہیں فریب دے رہا تھا، ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی تھیں کہ تم یہ کہانی سننا نہیں چاہتیں؟ تم یقیناً سننا چاہتی تھیں...... حالانکہ تم نے صاف انکار کیا تھا۔

تم ہمیں دھوکا دے سکتی تھیں مگر تم دیکھ لیتیں کہ تمہاری روح کیا کہہ رہی ہے...... مجھے انکار نہیں کہ تمہاری روح کو اذیت بھی پہنچ رہی تھیں۔ ضمیر تمہیں کچوکے بھی دے رہا تھا۔ مگر تم سننا چاہتی تھیں۔

''......اس کا نام مہر النساء تھا۔ لیکن جب جہاں گیر نے دیکھا کہ اس سے بڑھ کر اس جہاں میں اور کوئی حسین نہیں تو وہ بے اختیار ہو کر بولا تھا ''مہر النساء! تم سارے جہاں کا نور ہو۔ میں تمہارے اس نور پر ایمان لایا ہوں۔ آج سے میں تمہیں نور جہاں کے نام سے پکاروں گا......''

مگر یہ کہانی تو تم بچپن میں اپنی دادی اماں سے سنتی تھیں۔ اس وقت تم ماما جان کی زبان سے وہ خط پڑھوا کر سننا چاہتی ہو جو تمہیں بمبئی سے جان محمد بھیج چکا ہے...... جان محمد کو تم جہاں گیر کہتی تھیں نا؟

جہاں گیر کی یاد سے پھر تمہارے زخم تازہ ہو رہے تھے، تمہارے ناسور رسنے لگے تھے۔ تمہارے ارمان اور تمنائیں......اسی دوران ماما جان نے تمہارے خیالات کا

سلسلہ توڑ دیا اور وہ تمہیں خط پڑھ کر سنانے لگے:

میری ملکہ:

تمہارے بیٹے کی موت کی خبر سن کر مجھے کافی دکھ ہوا ہے میں تمہارے اس دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ پردیس میں نہ ہوتا تو تمہارے پاس ضرور آتا اور تم سے معافی مانگ کر نئے سرے سے تمہیں اپناتا۔ میں نے سنا ہے پیارے بچے کی موت نے تمہیں دق کے مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ تم اکثر اپنی زندگی پر روتی رہتی ہو لیکن یہ بزدلی ہے۔ تمہیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے میں فی الحال پچاس ہزار روپے بھیج دوں گا۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھنا۔

تمہارا...... جہاں گیر

اس خط کو سن کر تم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں تو ممانی نے اٹھ کر تمہارے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ دیا اور کتنی ہمدردی بھرے لہجے میں تم سے کہا ''نور جہاں'' یہ تم کیا کر رہی ہو؟ کیا تمہیں اس بات کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں کہ تم دوسرے درجے کی دق کی مریض ہو۔ تمہارے لئے کسی بات پر افسوس کرنا ٹھیک نہیں۔ تم بہت جلد تن درست ہو جاؤ گی۔ تمہیں علاج کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ بھی آ رہے ہیں''۔

ممانی کی زبانی یہ سب سن کر تم تڑپ کر رہ گئیں۔ تمہارے مونہہ سے ایک کرب ناک چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی...... تم ممانی کی طرف اس انداز سے دیکھ رہی تھیں گویا انہوں نے تمہیں بہت دکھ پہنچایا ہے۔ کچھ دیر بعد ان کے بدلے ہوئے رویہ کی وجہ تمہاری سمجھ میں آ گئی۔

جو ممانی پہلے تم سے سیدھے مونہہ بات بھی نہیں کرتی تھیں، وہی آج تمہارے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر تمہیں تسلی دے رہی تھی۔ تمہارے ساتھ تمہارے ماما جان بھی بیوی کی یہ کروٹ دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہے تھے، حالانکہ انہیں خوش ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اس وقت ممانی تمہارے ساتھ جو سلوک کر رہی تھی ایسے ہی سلوک کو دیکھنے کے وہ ایک مدت

سے تمنائی تھے۔ لیکن بیوی کے سامنے جو بازی وہ ہار چکے تھے وہی بازی آج یہ خط جیت رہا تھا۔ ممانی تمہارے لئے اب نہ صرف دوائیں لانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔ بلکہ تمہاری زندگی کے لئے دعائیں بھی مانگ رہی تھیں۔ اور یہ سارا کرشمہ اس خط کا ہے جس کو تمہارے ماما جان الٹ پلٹ کر اس طرح دیکھ رہے ہیں گویا یہ ناٹک ان ہی کا کھیلا ہوا ہے یہ اور بات ہے کہ اس خط نے تمہارے زخموں کو چھید ڈالا ہے، اس نے تمہارے دل وجگر کو نشتر بن کر کاٹا ہے۔ تمہاری روح اور ضمیر کانپ رہا ہے اور تم اپنے ماضی کی یاد میں ڈوب رہی ہو۔

"...... کہتے ہیں کہ جب اس نے سرِراہ جنم لیا تو ماں اسے اسی راہ پر چھوڑ کر چل دی تھی۔ قسمت کے کھیل دیکھئے کہ جب وہ بڑی ہوئی تو اسے جہاں گیر کی قربت میسر آئی۔ تمام عیش و آرام اس کے قدموں میں تھے۔ شہنشاہ اکبر نے جب اس کی رنگ رلیاں دیکھیں تو اسے تاؤ آ گیا۔ اس نے اس کی شادی شیر افگن کے ساتھ کر دی ......"

مگر میں یہ کب کہتا تھا کہ تم لاڈ پیار اور دلار کی فضا میں نہیں پہلی بڑھی تھیں۔ تم بہت خوب صورت ضرور تھیں، مگر تم نور جہاں نہیں تھیں۔ تمہارا نام بھی نور جہاں نہیں تھا۔ تم نے اپنے حسن کی قاتل گھاتوں کو دیکھ کر خود ہی اپنی نام نور جہاں رکھ دیا۔ اس نام کی مناسبت سے تم ان ہی دنوں جہاں گیر کے خواب بھی دیکھنے لگی تھیں۔ مگر تمہارے آدرش معیار پر کوئی نوجوان پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ پھر گھر والوں کی طرف سے تمہاری نسبت علی خان کے ساتھ کر دی گئی۔ علی خان تمہارا دور کا رشتہ دار بھی تھا۔ مگر تم اکثر اس بے چارے کا مذاق اڑایا کرتی تھیں تاکہ وہ تمہاری راہ سے ہٹ جائے اور تمہیں اپنی پسند سے اپنا جیون ساتھی چننے کا موقع ملے۔ تمہیں اپنی جوانی اور حسن کا کتنا غرور تھا! تمہارے اس غرور نے کتنے ہی نوجوان دلوں کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ تم ہمیشہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر پوشاکیں پہنتیں تھی۔ تمہارے والدین کو کتنی مجبوریوں کا سامنا کرتے ہوئے تمہارے یہ ناز اٹھانے پڑتے تھے۔ ان دنوں تمہارے ذہن پر صرف ایک جنون سوار تھا، اور اس

جنون میں تم شیر افگن کے ہوتے ہوئے جہاں گیر کی راہ دیکھتی تھیں۔

میں جانتا ہوں اس دن تمہاری خوشی کا کیا عالم تھا جب تمہیں جہاں گیر ملا تھا۔ شاید تمہیں اتنی خوشی نہ ہوتی اگر تمہارے اس جہاں گیر کی فرم میں تمہارا شیر افگن ملازم نہ ہوتا...... جان محمد پر ڈورے ڈال کر اب تمہیں علی خان کا مذاق اڑانے کا خوب موقع ملا تھا۔ مگر تم ایک بات بھول رہی تھیں۔ شیر افگن کو شہنشاہ اکبر...... نہیں، میرا مطلب ہے علی خان کو تمہارے گھر والے چاہتے تھے۔

جان محمد نے جب تمہیں اپنانے کا وعدہ کیا تو تمہاری شادی علی خان کے ساتھ کر دی گئی۔ یہ شادی تمہاری خوب صورت اور جوانی پر ایک چیلنج تھا...... تمہارا غرور اتر گیا۔

مگر تم عورت تھیں۔ عورت جب انتقام پر اتر آتی ہے تو کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انتقام کی یہ آگ تمہارے اندر ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی اس لئے کہ تمہاری سسرال کے سامنے جان محمد کی کوٹھی تمہاری ناکامی کی ایک یادگار سی بنی کھڑی تھی۔ اس ناکامی کا مکمل احساس تمہیں اس دن ہوا جب جان محمد نے ایک بڑے گھرانے کی خوب صورت لڑکی سے شادی کر لی۔

یہ شادی تمہاری زندگی کی ہار تھی، اور اس ہار نے تمہیں علی خان کو اپنانے کا احساس دلایا اور تم سب کچھ بھول کر عام بیویوں کی طرح اپنے سسرال میں رہنے لگیں۔ لیکن شیر افگن کے گھر سے جب تمہاری نظر جہاں گیر کے محل پر پڑتی تھی تو تم ایک آہ بھر کر رہ جاتی تھیں۔ تمہارا ماضی تمہیں کچوکے دینے لگتا تھا اور تم سوچنے لگتی تھیں "اگر علی خان بھی جان محمد جیسا امیر ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا" اس سے آگے جب تم بڑھ جاتی تھیں تو اس طرح سوچنے لگتی تھیں"۔ اگر جان محمد میرا بن جاتا تو میں اسے جان محمد نہیں بلکہ جہاں گیر کہا کرتی، اور اگر ایسا ہوتا تو میں اس کے ساتھ اس کوٹھی میں ایک رانی کی طرح رہتی"۔

اس سے بھی آگے جب تم بڑھ جاتی تھیں تو اس طرح سوچنے لگتی تھیں!" اگر جان محمد مجھے آج بھی پسند کر لیتا تو میں علی خان کو چھوڑ دیتی۔ میرا کیا بگڑتا؟ آخر میرے بھی

کچھ ارمان ہیں''۔ ایسے ہی خیالوں میں کھو کر تم اکثر کھڑکیوں اور دالانوں سے سامنے والی کوٹھی کو تکا کرتی تھیں۔ تم جان محمد کی بیوی کو دیکھ کر رشک و حسد کی آگ میں سلگتی تھیں۔ اور پھر اپنے آپ کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے تم بیگم جان محمد کی جگہ اپنے آپ کو تصور میں لا کر دن بھر اس کوٹھی پر حکمرانی کرنے لگتیں...... لیکن تمہارے سامنے حقیقت کھل کر جب خیالات کے تانے بانے ٹوٹ جاتے تھے تو تم اپنی طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر رہ جاتی تھیں۔ اور تم کھڑکی سے اس وقت تک ہٹنے کا نام بھی نہیں لیتی تھیں جب تک جان محمد کوٹھی پر موجود ہوتا۔

جان محمد جوان مرد تھا۔ وہ تمہارا دل دادہ بھی تھا۔ تمہارے اشارے پا کر وہ کب تک اپنے آپ کو سنبھالتا اور تم بھی رشک و حسد میں کب تک جھلستی رہتیں۔

مجھے وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے جب دو دل مل چکے تھے۔ ایک چاہت اور ایک آرزو تسکین پا چکی تھی۔ لیکن اس تسکین نے کتنوں کی مٹی پلید کی، یہ بات صبح ہوتے ہی سارا علاقہ جان چکا تھا۔

''......اور جب جہاں گیر نے شیر افگن کی غیرت کو للکارا تو شیر افگن میدان جنگ میں اتر آیا۔ اور اس نے تلوار میاں سے نکال کر گرجتے ہوئے کہا۔ ''شیر افگن اپنی جان دے سکتا ہے مگر مہر النساء کو نہیں چھوڑ سکتا'' اس جنگ میں شیر افگن نے یقیناً اپنی اجان دے دی اور نور جہاں سب کچھ چھوڑ کر جہاں گیر کے پاس آ گئی......''

جب تم جان محمد کے پاس آ گئیں تو سارے علاقے نے تمہاری اس حرکت پر بے زاری کا اظہار کیا۔ سب کی نظروں میں تمہاری قدر و قیمت گر چکی تھی، لیکن تم دونوں ان باتوں کے پروا کئے بغیر اپنا نیا گھر بسانے لگے تھے...... حالانکہ اسی دوران بیگم جان محمد اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ رہی تھی۔ وہ جان محمد کی دوسری شادی سے بے زار ہو کر یہاں کا قیمتی سامان، کپڑے، جائیداد اور نقد روپے اپنے میکے بھیج رہی تھی تا کہ اس طرح لوٹ کر ہی وہ جان محمد سے اس حرکت کو بدلہ لے سکے۔

بیگم جان محمد بھی ایک عورت تھی...... عورت جب بدلہ لینے پر اتر آتی ہے تو خانہ جنگی وہاں مستقل طور پر اپنا ڈیرہ ڈال دیتی ہے۔

مجھے معلوم ہے وہ تمہیں خود بھی طعنے دیتی تھی اور دوسروں سے بھی دلاتی تھی۔ مگر تم سب کچھ برداشت کر رہی تھیں، اس لئے کہ تمہیں جہاں گیر کی قربت حاصل تھی اور تم عالی جاہ کی اس قربت میں مسرت سے سرشار ہوتی جا رہی تھیں۔ تمہاری آپس کی رنگ رلیاں دیکھ کر بیگم جان محمد سلگتی رہتی تھی۔ جب اس کے لئے برداشت کی حد ہو گئی تو وہ میکے چلی گئی۔

اب اس کوٹھی پر صرف تمہارا راج تھا۔ مگر یہ راج تم زیادہ دیر تک نہ کر سکیں، اس لئے کہ جان محمد کوٹھی کی ساکھ قائم رکھنے کے لئے اپنی بیگم کو منا کر لے آیا تھا۔ تمہیں جہاں گیر کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری تھی۔ چند دن میں تمہاری یہ ناگواری فساد کی کروٹ لے چکی تھی۔ اس فساد کے درمیان جب جان محمد اپنے ماضی کی خوش گوار زندگی میں جھانکنے لگا تھا تو اسے صرف اس کے نشانات نظر آ رہے تھے اور جب وہ اس کے لٹنے کے اسباب دیکھنے لگا تو تمہارے سوا کوئی اور اس کی نظر میں آیا ہی نہیں۔ وہ تمہیں بے قصور بھی مانتا تھا، لیکن تم دونوں عورتوں کے درمیان اپنے مستقبل کو دیکھ کر وہ تم دونوں میں سے ایک کو مکمل طور پر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کس کو چھوڑ دے اور کس کو رکھ لے...... یہ سوال بہت دن تک اسے پریشان کرتا رہا۔ اگر وہ پہلی بیوی کو نکال دیتا تو اسے تنگ دست ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لئے کہ وہ اس کا سب کچھ لوٹ کر لے گئی تھی۔ پھر وہ تمہارے ساتھ کیا ہوا پیمان بھی ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کشمکش میں وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔ کافی غور و خوض کرنے کے بعد آخر چھوڑنے کا نشان اس نے تم پر ہی لگا دیا۔ لیکن وہ تمہیں کس بہانے سے چھوڑ دے۔ یہ مسئلہ وہ اس دن تک حل نہ کر سکا جب تک تم نے اسے وہ خوش خبری نہیں سنائی تھی۔ جان محمد نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور اس نے تمہارے سامنے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ”کیا ثبوت ہے کہ جو بچہ تمہاری کوکھ میں ہے، میرا ہی ہے۔ جو عورت علی خان کو چھوڑ سکتی ہے وہ جان محمد کی عزت کی

کیا قدر کر سکتی ہے؟''

اس وقت تمہارے اس وجود پر ایک بجلی سی گری تھی۔ تمہاری دنیا یقیناً اجڑ گئی تھی اور اس اجڑتی دنیا میں جب تم نے دیوانہ وار نگاہیں پھیلائیں تو تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا..... تم تنہا تھیں، اور یہ تنہائی تمہاری زندگی پر بدنامی و رسوائی کے تاریک سائے ڈال رہی تھی۔

''..... جب تک نور جہاں کو شہنشاہ جہاں گیر کی قربت نصیب تھی وہ دھرتی کی تمام خوشیاں اپنے دامن میں سمٹی پائی تھی۔ لیکن جہاں گیر کے مرنے کے بعد وہ سب کچھ کھو بیٹھی۔ جب وہ دوسروں کی دست نگر بن کر رہنے لگی تو شاہ جہاں نے اس کے لئے وظیفہ مقرر کیا، اور وہ اسی پر گزارہ کرنے لگی.....''

وقت گزرتا گیا

ڈاکٹر تمہارے بارے میں کورا جواب دے کر جا چکا تھا۔ تمہارے ماما اور ممانی اپنے گھر پر موت کے سائے منڈلاتے دیکھ رہے تھے۔ تم دق کے تیسرے درجے میں آ چکی تھیں۔ تمہارے چہرے پر واقعی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن تمہارے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا۔ گویا ابھی تم مرنا نہیں چاہتی تھیں، حالانکہ اس سے پہلے تم موت کی خواہش مند تھیں۔ آج تم جینا چاہتی تھیں..... صرف چند دن کے لئے، تاکہ تم جیتے جی جہاں گیر کے روپے واپس کر سکو..... اور ممانی تمہاری زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں، تاکہ جیتے جی تم جان محمد کے روپے پا سکو۔

تم دونوں کو ان پچاس ہزار روپے کا انتظار تھا..... مگر اس انتظار میں کتنا تضاد تھا!

موت کے سائے جو چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے، جب سمٹ کر اپنے مرکز پر آئے تو تمہاری موت کی خبر سارے علاقے میں پھیل گئی اور تم ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔

تمہاری اس خاموشی پر کتنی ہی عورتیں، مرد، بوڑھے اور بچے رو رہے تھے اور روتے

پچھتاتے تمہاری آخری رسمیں پوری کرر ہے تھے۔

تم کو دفنا کر جب سب لوگ چل دیئے تو اس وقت میں اکیلا تمہاری قبر پر کھڑا رہا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس وقت تمہارے ماما کے ہاں تمہارے ماتم میں شریک ہو نے کے لئے گیا تو تمہاری ممانی وہاں میرے بارے میں پوچھے گی اور تمہارے ماما سے میرے اس خط کے ساتھ پچاس ہزار روپے کے بارے میں دریافت کرے گی جس کا علم مجھے بعد میں ہوا تھا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ خط تمہارے ماما جان نے خود ہی میری طرف سے تمہیں لکھدیا تھا، تا کہ اس کی خاطر تمہیں ممانی کی ہمدردیاں اور خلوص ملے۔ زندگی کے آخری ایام میں

خیر جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا، اس وقت میں تمہاری قبر پر کھڑا تم سے معافی مانگ رہا ہوں......حالانکہ عام لوگوں کا خیال ہے کہ تم سے پہلے میں مر چکا ہوں!!

❁❁❁

کھوٹا سکہ

''میں اب تک کہاں تھا......؟ اور مجھے اس وقت کہاں جانا ہے......؟'' آپ اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے صرف آپ اخبار ''نشانات'' کی فائل سے وہ اخبار نکلوائے جو...... تاریخ مجھے یاد نہیں لیکن اس میں وہ سنسنی خیز واقعہ درج ہے جب عبداللہ صراف کو دو برقعہ پوش عورتوں نے دن دھاڑے لوٹ لیا تھا۔

''یہ کب کا واقعہ ہے......؟''

اس واقعہ کو ابھی چند مہینے ہی ہو چکے ہیں جب دو برقعہ پوش عورتیں کہیں سے ایک معصوم بچہ چرا کر لائی تھیں۔ اُنہوں نے بچے کو مٹھائیاں اور کھلونے دے کر بہلایا تھا۔ اور پھر اسے ریڈی میڈ قیمتی کپڑے پہنا کر وہ عبداللہ صراف کے پاس زیورات خریدنے آ گئی تھیں۔

''اچھا یاد آ گیا......؟ جنہوں نے تقریباً پچاس ہزار روپے کے زیورات پسند کر کے صراف سے کہا تھا۔ آپ ان کی ایک فہرست بنا دیجئے''۔

صراف نے فہرست بنا کر دی تو ایک عورت نے کہا تھا...... ''میں سامنے والی بلڈنگ میں جا کر والدین کو دکھا کر آتی ہوں۔ تب تک میرا یہ بچہ اور میری یہ بہن یہیں رہے گی۔

''ہاں کچھ دیر بعد اس عورت نے صراف سے کہا تھا۔ نہ جانے میری بہن کو واپس آنے میں دیر کیوں ہو گئی میں بچہ رکھ کر ابھی اُسے لے کر آتی ہوں''۔

''اور اس طرح دونوں عورتیں ایک کے بعد ایک کر کے ایسے چلدی تھیں کہ پھر کبھی واپس نہیں آئیں''۔

''بڑی چار سو بیس عورتیں تھیں ......لیکن آج آپ کو اس واقعہ کو دوبارہ دیکھنے کی ضرورت کیوں پڑی......؟''

''اس لئے کہ ایک عورت گرفتار ہوگئی ہے۔ شاید یہ وہی عورت ہو لیکن ابھی آپ اس خبر کی تشہیر نہ کریں جب تک کہ میں اس کی پوری تفصیل دیکھ کر نہیں آؤں۔ اس وقت اُس عورت کی تفتیش ہو رہی ہے۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں......''

آج صبح جب میں گھر سے نکلا تو راستے بھر چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ یہ نامہ نگار ہونا بھی کیا مصیبت ہے۔ چند روز سے مجھے ''نشانات' کے لئے ایک بھی سنسنی خیز واقعہ نہیں ملا ہے۔ نہ جانے ایسے واقعات کیوں عنقا ہوگئے ہیں۔ اب کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ہی ہو جاتا، میں اسی کو نمک مرچ لگا کر ایڈیٹر کو دے آتا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہا ہوگا۔ کل اخبار کا سنڈے ایڈیشن نکلے گا اور آج......اتنے میں ایک بھکارن کی آواز سنائی دی۔

''بابا......! خدا کے لئے ایک پیسہ دیدیں۔ اس بچے کو اپنے بچوں کی خیرات دے دے......!''

میں ''معاف کرنا'' جیسا روایتی لفظ استعمال کر کے جا رہا تھا کہ مجھے اس کے بچے نے اپنی طرف متوجہ کیا جو ماں کی گود میں بلک بلک کر رو رہا تھا۔

معصوم بچے کی ٹانگیں نہ جانے کس طرح جل گئی تھیں۔ درد کی ٹیس سے وہ ماں کی گود میں طائر مجروح کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی حالت مجھ سے نہ دیکھی گئی۔ میں جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سکہ نکال کر ابھی اسے دے ہی رہا تھا کہ دوسری بھکارن حاضر ہوئی تھی۔

''ایک پیسہ اس بچے کو بھی دے دے بھائی! دو دنوں کا بھوکا ہے۔ خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے!''

''معاف کرنا میرے پاس اب کوئی پیسہ نہیں۔ میں آگے بڑھا وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور ایک چونی کے لئے ایسی ایسی دعائیں دینے لگی گویا ساری خدائی اُسی کے

ہاتھ میں تھی۔ میں اس کی یہ دعائیں ایک کان سے سن کر اور دوسرے کان سے اڑا کر جا رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ وہ گود میں لئے ہوئے بچے کو چٹکی سے کاٹ رہی تھی تا کہ یہ بھی اُس بھکارن کے بچے کی طرح روئے اور مجھے اسے پیسے دینے کے لئے ترس آئے۔ میں نے اسے کتنی بار کہہ دیا کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے مگر وہ ہرگز نہیں مانی اور میرے ساتھ کچھ اس طرح پیش آئی گویا میں اس کا مقروض تھا۔ میں اس سے چھٹکارا جا رہا تھا کہ وہ جلدی جلدی تیور بدل کر انکساری سے بولی۔

''ایک روپیہ دیدے بھائی! آپ کا کچھ کم نہیں ہوگا۔ خدا آپ کو سات بیٹے دیگا''

میں ایک دم رک گیا اور بولا...... ''ایسی بد دعائیں نہ دو، تم کو معلوم نہیں آج کیا زمانہ اور کونسا دور ہے......؟ یہ فیملی پلاننگ کا زمانہ اور لوپ کا دور ہے۔ تم جیسے لوگوں کو اس زمانے کے ساتھ بدلنا چاہیے۔ اپنی پٹی پٹائی دعائیں بدلنے چاہیں کیونکہ پچھلے زمانے کی نیک دعائیں اس زمانے کی بد دعائیں ہیں۔ آئندہ کبھی تم کسی فیملی کے پاس پیسے مانگنے جاؤ گی تو تم انہیں کہہ دینا خدا کرے تمہارے زیادہ بچے نہ ہوں، پھر دیکھنا تم کو کتنے پیسے ملیں گے...... تم حیران مت ہونا یہ وقت کا تقاضا ہے''۔

''بھئی! ہماری بھکاری دنیا تو اس سے مختلف ہے'' بھکارن نے میری باتوں میں دل چسپی لیتے ہوئے کہا...... ''ہماری بھکار دُنیا میں وہ مرد یا عورت بڑی خوش نصیب ہے جس کے پاس زیادہ بچے ہوں، چاہے وہ حرامی ہوں یا چوری کے''۔

''چوری کے......! کیا تم لوگوں کے پاس چوری کے بچے بھی ہوتے ہیں......؟''

''آپ میرا مطلب نہیں سمجھے......؟'' وہ میرا سوال گول کر کے بولی ''میرے کہنے کا مطلب ہے، کسی بھکاری یا بھکارن کے پاس بچہ ہونا ایک کاروبار ہونے کے برابر ہے۔ اب اگر بچہ بھوکا ہوگا۔ بیمار یا زخمی ہو تو اس بھکارن یا بھکاری کو ہماری دُنیا بڑی بھاگیہ وان سمجھتی ہے آپ کو جاننا چاہئے یہ کاروبار میرے پاس بھی ہے۔ مگر بدقسمتی سے نہ یہ بھوکا ہے نہ ہی بیمار اگر ایسا ہوتا تو اُس بھکارن کی طرح آپ نے مجھے بھی کچھ نہ کچھ دیا ہوتا''۔

"نہیں ایسی بات نہیں دراصل میرے پاس ریزگاری نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں کچھ دے نہ سکا......"

میں صرف آپ کی بات نہیں کرتی، اُس بھکارن کی نسبت لوگ مجھے نظرانداز کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اُس کا بچہ ایک مہینہ ہوا جل گیا ہے۔ اس ایک مہینے میں اگر اس کا علاج کیا گیا ہوتا۔ اس کے زخموں پر دوائی لگائی گئی ہوتی تو وہ اب تک ٹھیک ہو گیا ہوتا۔ لیکن وہ بھکارن ایسا نہیں کر سکتی ہے۔ ایسا کرے گی تو میری طرح اس کا کاروبار ماند پڑ جائے گا...... میں جانتی ہوں کہ وہ بچے کی تکلیف اور اس کی آہ وزاری کو دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ جاتی ہے۔ مگر وہ مجبور ہے اس لئے کہ یہ وقت کا تقاضا ہے"۔

"بہت خوب......! تم تو فلسفیانہ باتیں کرتی ہو۔ آج پہلی بار میں ایک بھکارن سے ایسی باتیں سُن رہا ہوں"۔

"آپ کی باتوں میں اس زمانے کے لئے طنز دیکھ کر میں دل کی بات اُگلنے کے لئے مجبور ہو گئی اس لئے کہ آپ جیسے لوگ صرف ہمارے ظاہر کو دیکھ کر پیسے دیتے ہیں۔ باطن کو نہیں...... اس بھکارن کو زخمی بچے کے کارن پیسے ملتے دیکھ کر میں چاہتی ہوں کہ میرے اس بچے کو بھی کچھ ہو جائے مگر جب اسے کچھ ہو جاتا ہے تو اس پر میں مرمٹتی ہوں۔ یہ جان کر بھی کہ یہ میرا اپنا بچہ نہیں ہے"

"اچھا...... یہ تمہارا بچہ نہیں ہے کیا......؟"

"نہیں، یہ میرا اپنا بچہ نہیں ہے۔ میں اسے کسی سے مانگ کر لائی ہوں، اور اپنا جان کر اسے اپنا رہی ہوں......، یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے" کہتے ہوئے اس نے بچے کے دونوں رخسار چوم لئے اور چلتے چلتے بولی "اب دیکھئے نا کچھ کتنی باتیں کروائیں آپ نے؟"

"پیسے بٹورنے کا تمہارے پاس بہت اچھا آرٹ ہے۔ ایسا آرٹ میں نے سبھی بھکارنوں میں نہیں دیکھا، میں سچ کہہ رہا ہوں تم کو بھکارن نہیں ہونا چاہئے تھا تم جیسی عورت کو......

"کسی راجہ کی رانی ہونا چاہئے تھا"۔ جب اُن نے میری بات کو پورا کیا میں نے اقرار کیا تو وہ بولی:

"اب دیجئے نا ایک روپیہ خدا آپ کو راجہ بنا دے گا"۔

اس کی یہ دعا میرے اندر سرایت کر گئی۔ میں اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس وقت اس کا روپ میری نگاہوں میں مشکوک ہونے لگا۔ میری نیت متزلزل سی ہونے لگی۔ میں اسے ٹٹولنا چاہتا تھا کہ وہ پھر بولی "آپ ایک روپیہ دینگے تو آپ کا کچھ کم نہ ہوگا"۔

"میرے پاس کوئی روپیہ نہیں۔ پھر کبھی دوں گا۔ اس وقت مجھے جانے دو!"

"آپ کے پاس روپے ہیں۔ مگر آپ دیتے نہیں۔ شاید آپ کو میرے اس بچے پر ترس نہیں آتا اگر یہ بات ہے تو...... آج میں صراف کے پاس ضرور جاؤں گی، اور اسے زخمی کرا کے آؤں گی۔ پھر دیکھتی ہوں کون مجھے پیسے نہیں دیتا"۔

"عجیب انکشاف ہے......" میں نے حیران ہو کر پوچھا...... "صراف کے پاس کوئی زیور خریدنے یا فروخت کرنے جاتا ہے، نہ کہ بچے کو زخمی کرانے، اس کام کے لئے صراف کے پاس جانے کا مطلب......؟"

"آپ نہیں جانتے ہیں میں جب بھی اُس کے پاس بھیک مانگنے جاتی ہوں تو اس بچے کو دیکھ کر اس کے غصے کا پارہ ایسا چڑھتا ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ ڈالے۔ وہ مجھے ہر بار کہتا ہے تم نے مجھے پھر کبھی اس منحوس کی شکل دکھائی تو اس کو میں جان سے ختم کروں گا"۔

وہ ایسا کیوں کہتا ہے......؟

"پاگل ہے بے چارہ! قصور اس کا اپنا ہے، اور چھانٹا ہے اس معصوم پر"۔

"تم کس صراف کی بات کر رہی ہو......؟"

"......میں نام نہیں جانتی، امیرا کدل کے پار اس کی دُکان ہے۔ کوئی عورت اس سے ہزاروں روپے کی زیورات لے گئی تھی اور اس کے عوض اُسے یہ بچہ دے گئی تھی...... جب وہ

اُس عورت کا پتہ لگانے میں ناکام ہوا تو اس بچہ سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس نے اسے پولیس کے حوالے کیا۔ جہاں سے میں نے اسے گود لے لیا۔

''اچھا تو یہی وہ بچہ ہے......اب میں سمجھ گیا

''نہیں......، آپ غلط سمجھ گئے......خیر جانے دیجئے، اگر کچھ دینا ہے تو دیجئے خدا تمہارے بچوں کو سلامت رکھے''۔

''تم میرا پیچھا کہاں چھوڑو گی، چلو آؤ میرے ساتھ میں کسی دکاندار سے ریزگاری لیتا ہوں'' میں چل دیا، اور وہ میرے ساتھ ہولی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ آنا بھی چاہتی تھی۔ اور نہیں بھی آنا چاہتی......میں نے تھوڑی دور جا کر اسے پوچھا۔

''تم بھیک کیوں مانگتی ہو، اس سے تم کو ملتا کیا ہے۔ تم ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتیں جس سے تمہیں روز روز کے اس جھنجھٹ سے نجات ملے''

''کیا کریں گے ہماری قسمت ہی ایسی ہے، ویسے بھی یہ ہمارا موروثی پیشہ ہے''

''اگر تم چاہو گی تو تم اپنی قسمت بدل سکتی ہو''۔

''کیسے......؟''

''میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں۔ اس پر چل کر تمہیں کبھی بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئے گی!''

''میں سمجھتی ہوں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ مگر مجھ سے ایسا نہیں ہوگا۔ میں بھوکے مرنا برداشت کروں گی۔ مگر کسی کو نہیں لوٹوں گی''۔

''تم نے یہ کیسے جان لیا میں تمہیں یہی ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں''۔

''ویسے ہی میری گود میں چوری کا بچہ ہے نا''۔

تم بہت ہوشیار عورت ہو، تم کو ہرگز بھکارن نہیں ہونا چاہئے تھا۔ تم دل کی بات چہرے پر پڑھتی ہو، میں تمہاری وسعتِ نظر کا قائل ہوگیا''۔

''بس اب زیادہ تعریف مت کیجئے۔ میری کوئی حیثیت نہیں''۔

"تمہاری کیا حیثیت ہے، وہ میں اچھی طرح جان گیا ہوں۔ میرے خیال میں تم روز روز بھیک مانگنے کے بجائے ایک بار ایسا ڈاکہ ڈالو جو تمہارے جنم جنم کے کام آئے...... تم کو شاید معلوم نہیں، آج کل ایسی عورتوں کی بہتات ہے، جو نگر نگر گھومتی ہیں۔ اور بڑے بڑے دکان داروں اور صرافوں کو لوٹتی ہیں۔ ایسی عورتوں کی تلاش میں ساری انٹلیجنس لگی ہے۔ مگر وہ انہیں ایسا چکمہ دیتی ہیں کہ سب کے سب ہاتھ مل کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی عورتوں نے بڑے بڑے مرد ڈاکئوں کو بھی پچھاڑ دیا ہے"۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت جو کوئی بھی کام کرتی ہے وہ بڑی ہوشیاری سے کرتی ہے۔ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے"۔

"مگر تم کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے"۔ میں متبسم ہونٹوں سے بولا۔

وہ جھیپ سی گئی۔ میں آگے بڑھتے ہوئے کہا "تم ایسی عورت ہو جو دوسروں کے چہرے سے ان کے اندر کا حال دیکھنا جانتی ہو۔ تم دوسروں کی باتوں میں چھپا ہوا طنز دیکھنا بھی جانتی ہو۔ تم عورت ذات کی فطرت سے بھی واقف ہو اور بھکار زندگی کا فلسفہ بھی جانتی ہو۔ تم حاضر جواب بھی ہو اور اپنے دل کا مدعا اشاروں میں بیان کرنے میں بھی مہارت رکھتی ہو......، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔ میرا مشورہ مانو تو تم کسی سے شادی کرلو!

"میں نے اب تک کتنی جگہ ایسی قسمت آزمائی کی مگر...... مجھے پھر اسی زندگی میں لوٹ آنا پڑا"

میں چند قدم آگے بڑھ کر بولا

"اگر تم نوکری کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں ایک ایسی جگہ لگادوں گا۔ جہاں تمہیں اچھی تنخواہ ملے گی...... اچھا کھانا، پینا ملے گا...... وہاں تم بڑے عیش و آرام میں ہوگی۔

"کہاں......؟"

جہاں میں تم کو لے جاؤں گا...... آؤ تم میرے ساتھ!"

ہم دونوں اکٹھے جا رہے تھے میں دیکھ رہا تھا وہ بے دلی سے میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی......راستے چلتے ہوئے نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔ مگر میں اس کے بارے میں یہی سوچ رہا تھا۔ اگر اسے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے ہاں نوکری مل گئی تو اس کی زندگی بدل سکتی ہے۔ اُنہوں نے ایک آیا کی ضرورت کا اشتہار مجھ سے ہی اخبار میں دلوایا تھا۔ نہ جانے وہ جگہ ابھی تک خالی ہوگی یا نہیں......اس وقت وہ دفتر میں ہی ہوگا۔ لہٰذا ہمیں وہاں ہی اُس سے ملنا چاہئے''۔

ان ہی خیالات میں چلتے بڑھتے جب میں پولیس اسٹیشن کے اندر جانے لگا۔ تو میں نے دیکھا بھکارن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ اس کے دل کی دھک دھک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ میں اس کی کمزوری اور بزدلی پر مسکرایا اور بولا...... ''تم کیوں گھبراتی ہو، میں تم کو پولیس اسٹیشن کے اندر لے جاؤں گا۔ آؤ تم میرے ساتھ!''

میں گیٹ سے اندر آ کر آگے بڑھ رہا تھا......میں نے مڑ کر دیکھا۔ بھکارن بچہ سڑک پر رکھ کر بھاگ رہی تھی...... بھکارن کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر پہلے میں اس کی بزدلی اور معصومیت پر مسکرادیا لیکن......یکایک میرے دل میں ایک خیال کوندگیا ہو نہ ہو اس کے دل میں ضرور چور ہے......اس کو شاید شک ہوا ہے۔ میں اسے چالبازی سے یہاں لایا ہوں، اب یہ مجھے گرفتار کروائے گا......دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ورنہ یہ بچے کو یہاں سڑک پر رکھ کر نہیں بھاگ جاتی۔ میرے خیال میں یہ کوئی بھکارن نہیں ہوگی۔ ایسی عورتوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ اس کی باتیں ویسے بھی مشکوک تھیں۔ مجھے اس کو فوراً گرفتار کروانا چاہئے۔

گرفتار کر کے جب اسے تفتیش روم میں لایا گیا تو میں اس کی اطلاع ایڈیٹر ''نشانات'' کو دینے گیا تھا......اب جب کہ میں واپس دوبارہ پولیس اسٹیشن آ گیا۔ تو ڈی آئی جی نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا:

"آپ نے آج وہ کمال کر کے دکھایا جو بڑے بڑے جاسوس بھی نہیں کر پاتے ہیں......آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی۔اس عورت کی جامہ تلاشی سے تین بٹوے۔ دو رسٹ واچ برآمد ہوئے۔اس کا کہنا ہے، وہ آپ سے بھیک مانگنے کی آڑ میں آپ کی جیب کاٹنے کے لئے آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔آپ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی، اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی......"

"یعنی......؟ میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے اُٹھ کر مجھے میری وہ کٹی ہوئی جیب دکھائی جس میں سے سب کچھ نکالا گیا تھا۔میں ہکا بکا ہو کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ انہوں نے کہا......

"اس نے نہ صرف عبداللہ صراف کو لوٹنے کا اقرار کیا ہے بلکہ اس نے ایسے بہت سے کارنامے کئے ہیں۔اس کے ساتھ ایک بہت بڑی گینگ کام کر رہی ہے جن کی گرفتاری اس وقت دھڑا دھڑ ہو رہی ہے۔یہ سارا کارنامہ آپ کا ہے۔اس کے صلہ میں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی طرف آپ کو ایک اچھی نوکری کی آفر کی جائے گی۔

شکریہ......! نوکری کی بات فی الحال رکھ دیجئے مجھے اس وقت اخبار کا کالم لکھنا ہے۔کل ہمارے اخبار کا سنڈے ایڈیشن ہے۔

آنکھیں

''نہیں نہیں......!!! ایسا نہ کہئے ڈاکٹر! میں آپ کے پیر پڑتی ہوں۔ آپ مجھ پر یہ احسان کیجئے ڈاکٹر!''

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے کیا......؟''

''ہاں ڈاکٹر! میرا دماغ ٹھیک ہے۔ صرف میری آنکھیں......خدا کے لئے آپ میری یہ آنکھیں نکال دیجئے۔''

''میں نے ایک بار کہہ دیا ہے، مجھ سے ایسا نہیں ہوسکتا''

''کیوں نہیں ہوسکتا، آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ آنکھوں کے ڈاکٹر میں آپ کو مجبور کررہی ہوں۔ پھر آپ کو اس میں اعتراض کیا ہے؟''

''تم اپنی یہ آنکھیں نکالنا کیوں چاہتی ہو۔ آنکھوں کے بغیر تم جیوگی کیسے؟''

''اس کی آپ فکر نہ کیجئے، ان آنکھوں کے بغیر میں جیوں گی اور اچھی طرح جیوں گی۔ مجھے اِن آنکھوں کی کوئی ضرورت نہیں جنہوں نے مجھے قدم قدم پریشان کردیا ہے، جنہوں نے مجھے بڑی الجھنوں میں ڈال دیا ہے''

''عجیب عورت ہو تم، مجھے یقین ہے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں''۔

''غلط......، ڈاکٹر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے دماغ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں''۔

''اگر تمہارا دماغ ٹھیک ہے تو پھر تم آنکھیں نکلوانا کیوں چاہتی ہو۔؟''

"ڈاکٹر! جن آنکھوں کے نکالنے کے لئے میں آج آپ کے سامنے منت سماجت کر رہی ہوں، یہی آنکھیں نہ نکالنے کے لئے میں کبھی روئی ہوں، گریہ وزاری کی ہے میں نے مگر...... یہ سب بے سود"۔

"......تو کیا...... کیا تمہاری آنکھیں کبھی نکالی بھی گئی ہیں"

"......ہاں اُن دنوں میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے یاد ہے میں اپنے والدین کے ساتھ میلہ دیکھنے گئی تھی"۔

"کونسا میلہ......؟"

"مجھے یاد نہیں"

"کیوں......؟"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟"

"لگتی تو تم پچاس برس کی ہو،

اگر پچاس برس ہی مان لیں تو آج سے پینتالیس برس پہلے جب میری عمر صرف پانچ سال کے لگ بھگ تھی، میں نہ جانے اپنے ماں باپ کے ساتھ کہاں کونسا میلہ دیکھنے آئی۔ البتہ یہ بات یاد پڑتی ہے کہ اُس میلے میں ہم ایک جگہ بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے کہ میری نظر ایک غبارے والے پر پڑی اور میرا دل ایک رنگین غبارہ لینے کے لئے مچل گیا، میں نے ماں سے غبارہ لینے کے لئے پیسے لئے اور غبارے والے کے پیچھے دوڑی بھاگی...... کچھ دور جا کر میں نے اُسے جالیا"۔

"پھر کیا ہوا......؟"

"غبارہ لیکر میں خوشی سے اُچھلتی کودتی واپس آرہی تھی کہ ایک شخص نے جھٹ گود میں لے کر مجھے بیٹی کہہ کر چوما اور میرے ہاتھ میں مٹھائی کا لفافہ تھما دیا...... یہ کون شخص تھا؟ میں اُسے تب جانتی تھی نہ اب جانتی ہوں۔ اُس نے مجھ سے اور باتوں کے علاوہ میرے ماں باپ کے بارے میں بھی پوچھا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں جب میں

نے اُس کی باتوں کا صحیح صحیح جواب دیا تو اس نے مجھے اپنے بیٹے سے ملانے کے لئے کہا، کافی دور پہنچ کر اس نے مجھے ایک کار میں بٹھا دیا جس میں دو آدمی ایک چھوٹے بچے کو مٹھائی کھلا رہے تھے۔ جونہی میں اس کار میں بیٹھ گئی کار پھر سے چل دی...... میں چلائی تو میرا منہ بند کر کے مجھے اُس جھوٹے لڑکے کے ساتھ سیٹ پر لٹا دیا گیا اور نہ جانے کہاں لے جا کر ہم دونوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا"۔

"پھر کیا ہوا......؟"

"دوسرے تیسرے روز اُنہوں نے ہمیں ٹرین میں بٹھا کر نہ جانے کہاں اور کدھر بھیج دیا......اپنے قبضہ میں کرنے کے چند روز بعد اُنہوں نے لڑکے کے بازو اور ٹانگیں توڑ دیئے اور میری آنکھیں نکال دیں!"

"اف......فو!۔ پھر کیا ہوا؟!"

"اس درد سے جب مدت کے بعد میں سنبھل گئی تو پھٹے پُرانے کپڑے پہنا کر مجھے بھیک مانگنے کا سبق سکھا دیا"

"تم نے کیا کیا......؟"

"میں دو تین بھکاریوں کے قبضے میں گلی گلی سڑک سڑک (اندھی بیٹی کا ایک پیسے کا سوال ہے بابا) پکارتی رہی اور زندگی کے یہی راستے طے کرتے ہوئے بڑی ہوگئی۔"

"تم نے کسی کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کیا؟!"

"میرے ساتھی جو سائے کی طرح اپاہج بن کر میرے ساتھ ساتھ رہتے تھے، مجھے کسی کے سامنے بھی اپنی روداد سنانے نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی کئی بار میں نے اس کی کوشش کی مگر......مگر مجھے اس کی کڑی سزا بھگتنی پڑی، اُس کڑی سزا کا آج بھی تصور کرتی ہوں تو کانپ اُٹھتی ہوں"

"کیا کیا اُنہوں نے تمہارے ساتھ؟"

"ایک بار ایک عورت نے مجھے پیسے دیتے ہوئے میرے ماں باپ کے بارے

میں پوچھا۔ میرا دل بھر آیا۔ میں اُس سے اپنی روداد کہنے لگی تھی کہ مجھے فوراً وہاں سے کھسکا دیا گیا اور ٹھکانے پر لے کر مجھ پر کوڑے برسائے گئے اور کئی دنوں تک میرا دانہ پانی بند کیا گیا۔ ایسے ہی واقعے جب چند ایک بار پیش آئے تو میں نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے مجھے جس طرح چاہا استعمال کیا۔ میں دن کو اندازے کے مطابق بیس تیس روپے کماتی تھی۔ لیکن کھانے کو مجھے روکھی سوکھی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا...... میری جیسی دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کی کمائی پر یہ لوگ بڑے بڑے کاروبار کرتے تھے۔ عیش کرتے تھے اور ہم...... مشرق، مغرب جنوب وشمال گھومتے گامتے اپنا دھندا کرتے کرتے اپنی زندگی گزارتے رہے"

"اس گروہ سے پھر تم کیسے چھوٹ گئیں؟"

"اِسے آپ ایک اتفاق سمجھ لیجئے ڈاکٹر! ہماری ایک جماعت کو دھندا کرنے کیلئے کشمیر بھیجا گیا۔

"اچھا...... تم نے کشمیر بھی دیکھا ہے"۔

"کاش! اُن دنوں میری آنکھیں ہوتیں، جن دنوں میں کشمیر میں تھی...... ویسے میں اُس کشمیر کو کبھی نہیں بھولوں گی جس نے مجھے اُس گروہ سے آزادی دلائی"......

کشمیر میں دھندا کرتے ابھی ہمیں کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ وہاں کی پولیس نے تمام بھکاریوں پر چھاپہ مار کر اُنہیں گرفتار کر کے بیگر ہوم بھیج دیا...... اس طرح زندگی کے طویل سفر کے بعد مجھے اپنے ساتھیوں سے علیحدہ کر کے زنانہ وارڈ میں رکھا گیا"۔

"وہاں تم نے کیا کیا......؟"

"ہر کوئی بھکاری اور بھکارن وہاں اپنا اپنا کام کرتا اور اس کے عوض میں مفت کھانا اور پہننا ملتا تھا۔ ایک روز میں بیمار ہو گئی۔ مجھے بیگر ہوم کی ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔ جہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے میری بیماری کے ساتھ ان آنکھوں کے بارے میں بھی پوچھا...... میں نے اُسے اول سے آخر تک اپنی ساری روداد بتائی۔ میری زندگی کا المیہ

سُن کر اُس کا دل بھر آیا۔ دوسرے روز پولیس نے میرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے عدالت میں اُن کا چالان کر دیا۔ بد قسمتی سے اصلی سر غنے ہمارے ساتھ وہاں نہیں تھے، اس لئے وہ صاف بچ گئے۔ لیکن اُن کی تلاش اب بھی جاری ہے"

"پھر کیا ہوا......؟"

"میں بیگر ہوم میں اپنی بقیہ زندگی گزار رہی تھی کہ مجھے نئی آنکھیں لگوانے کے لئے یہاں بھیجا گیا۔

"اچھا! یہاں آکر تمہاری نئی آنکھیں لگ گئیں۔ لیکن تم انہیں نکلوانا کیوں چاہتی ہو؟"

"ڈاکٹر! ان آنکھوں نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔ بڑی الجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ میں حیران ہوں۔ جو بات میں سوچ نہیں سکتی وہ میں آنکھوں سے کیسے دیکھتی ہوں۔ میری سوچ اور نظر میں اتنا تضاد ہے کہ میں قدم قدم پر چونک اٹھتی ہوں...... برسوں کی تاریک اور گھناونی زندگی میں میں ایک محدود دائرے میں پلی بڑھی ہوں۔ مجھے اپنے سماج، قوم اور ملک کا بالکل پتہ نہیں۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتی، نہ جاننے کی ضرورت ہے"۔

"ہوتا کیا ہے تمہیں؟"

"مجھے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے لیکن میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی، اظہار کروں گی تو تشریح نہیں کر سکتی۔ آپ یہ جان لیجئے۔ اگر میرا دل اپنے آپ کی فکر کرتا ہے کہ میں کیسے جیوں؟ تو میری یہ آنکھیں مجھ کو چھوڑ کر ملک کی فکر میں پریشان ہو جاتی ہیں۔ دل اور نظر کے اس تضاد کو دیکھ کر میرا دماغ ماؤف سا ہو جاتا ہے۔ میں سب کچھ بھول کر ایک چھوٹے سے خستہ حال کمرے میں بیٹھ کر اپنے بارے میں سوچتی ہوں تو میری نظر پرواز کرتے کرتے بیک وقت ماسکو، نیویارک، لندن پیکنگ، پیرس، ٹوکیو وغیرہ جیسے مقامات پر پہنچ جاتی ہیں۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"اتنا ہی ہوتا تو کوئی بات نہ تھی ڈاکٹر! خیالوں ہی خیالوں میں دنیا میں گھوم پھر آ کر جب میں سب کچھ بھول کر سو جانا چاہتی ہوں تو فوراً ذہن سے بغاوت کر کے میری یہ آنکھیں آپ ہی آپ بنگال، راجستھان، پنجاب، آسام، کشمیر، بہار، کیرالا اور دوسری ریاستوں میں پہنچ جاتی ہیں اور وہاں کے بدلتے حالات دیکھ کر مجھے رات بھر پریشان کرتی رہتی ہیں۔"

"کیوں......؟ آخر کیوں؟!"

"یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں......، میں اپنی حیثیت کے چند لوگوں سے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں تو میری نظریں ایک دم ملک کے بڑے بڑے لیڈروں اور سیاست دانوں پر جا کر ٹھہرتی ہیں۔ میں اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتی ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے فوراً ملکی و غیر ملکی مسائل آجاتے ہیں۔ اس طرح اُلجھنوں اور پریشانیوں میں گھر کر میں راہ فرار اختیار کر کے بچ نکلنا چاہتی ہوں تو میری نظر پھر دل اور دماغ کو دھوکہ دے کر چلی جاتی ہے اور وہاں سے کیا کچھ دیکھ کر آتی ہے۔ اگر میں اس کا اظہار کروں گی تو ایک انقلاب آجائے گا۔ جس سے سارا ملک درہم برہم ہو سکتا ہے"

"پھر تم کیا کرتی ہو......؟"

"میں کر بھی کیا سکتی ہوں...... میں تو سب کچھ بھول کر اپنے لئے ایک چھوٹا سا گھر بنانا چاہتی ہوں، یکا یک میری نظروں میں بڑی بڑی عمارتیں، بڑے بڑے ڈیم، کارخانے اور فیکٹریاں آجاتی ہیں......، میں چھوٹے سے گھر میں اپنے جیون ساتھی اور اپنے بچوں کا تصور کرتی ہوں، تو میری نظر میں ملک کے لاکھوں اور کروڑوں لوگ آجاتے ہیں۔ اس طرح میری سوچ، میرے خیالات اور میرے ارادوں کے ساتھ میری نظر کوئی اتفاق نہیں کر پاتی۔ میرا جو دل چاہتا ہے نظر وہ مانتی نہیں۔ یہاں تک کہ میں پاگل ہو گئی......، اگر آپ جلد میری یہ آنکھیں نہیں نکال دیں گے تو میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی؟

"تم گھبراؤ نہیں میں سب سمجھ گیا۔ تمہاری یہ آنکھیں نہیں نکالی جائیں گی۔ بلکہ

تمہارے دل اور دماغ کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ ان نظروں کو بار سہہ سکیں۔ اگر تمہارے دل اور ذہن نے تمہاری نظروں کا بار سہہ لیا۔ تو سارے ملک کے لئے یہ نیک فال ہے، کیونکہ اس ملک کو ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے جس کی آنکھیں تمہارے پاس ہیں"

"کس کی ہیں یہ آنکھیں ڈاکٹر......؟!"

"......میں بتاؤں گا لیکن تم مچلنا نہیں......، وہ دیوار پر تم کلینڈر دیکھ رہی ہو؟"

"ہاں! اس پر ایک عورت کی تصویر ہے جس کے سر پر گھنیرے سیاہ بال ہیں۔ لیکن دائیں جانب ماتھے سے ذرا اوپر سفید بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا ہے"۔

"بہت دن ہوئے اس ملک کی باگ ڈور اسی عورت کے کاندھوں پر تھی۔ اُس نے اپنی زندگی میں یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں Eyes Bank کو دے دی جائیں تا کہ یہ کسی اندھے کے کام آسکیں......

اس کے مرنے کے بعد ملک کی جو حالت ہوگی تم اُسے انہی آنکھوں سے دیکھو اور اپنے آپ کو انہی حالات کے سانچے میں ڈھال کر اپنے آپ کو تیار کرو۔ کیونکہ تمہیں ایک بہت بڑا کام انجام دینا ہے۔ اُٹھو، اپنے دل کو مضبوط کرو اور اپنے آپ کو......

......میں نے کہا، تم یہ نیند میں کیا بڑ بڑا رہے ہو؟"

"اُوں......ہونہہ! امم......میں کہاں ہوں؟"

"تم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے؟"

"ہاں! میں ایک خواب دیکھ رہا تھا......

"خواب......میں......"

کونسا؛ کیسا خوب......ڈاکٹر سے بیوی نے پوچھا

ہندوستان کے مستقبل کا......؟"

"جب سے تم آئیز بنک کے ڈائرکٹر بن گئے ہو۔ تم ایسے ہی خواب دیکھا کرتے ہو"

"دیکھو، میری بات سنو۔ جو اندھی بھکارن یہاں اکثر بھیک مانگنے آتی ہے اگر وہ آج بھی آگئی تو اُسے تم میرے پاس ہسپتال بھیج دینا، اُس کیلئے آنکھیں میرے پاس آگئی ہیں"

"اچھا......، کس کی ہیں وہ آنکھیں؟!"

"اُوہ! مجھے معاف کرنا، ابھی آنکھیں نہیں آئی ہیں صرف اُن آنکھوں کے بارے میں مسز اندرا گاندھی کی وصیت آئی ہے"۔

راتوں کے اُجالے

مسز قریشی اس وقت خلاف معمول میک اَپ کرنے کے بعد اپنے شوہر مجسٹریٹ محمد اکرم قریشی کا انتظار کررہی تھی۔ اس کے اس انتظار میں کم از کم وہی کیفیت ہویدا تھا جو سہاگ کے دنوں ہوا کرتی تھی۔

قد آدم آئینے کے سامنے اپنے آپ کو دیکھ کر اسے اس ادھیڑ عمر میں بھی اپنے حسنِ موزونیت اور جوانی پر رشک ہورہا تھا۔ اگر چہ اندر سے وہ دروازہ بند کرچکی تھی۔ پھر بھی ایک نظر اور دروازے کی طرف ڈال کر اس نے آئینے کے سامنے اپنے آپ کو زور سے بھینچ لیا اور جذباتی انداز میں آگے بڑھ کر اس نے آئینے کے ساتھ اپنے سرخ ہونٹ لگا کر عکس کے منہ کو اس طرح چوما گویا آئینے میں اُس کا اپنا عکس نہیں بلکہ مجسٹریٹ قریشی کھڑا ہو۔

آئینے کے سامنے سے ہٹ کر اُس نے دیوار پر قریشی صاحب کی تصویر کو اُتار کر پہلے اسے بغور دیکھا اور پھر بے صبری سے اُسے اپنی چھاتی پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے تصویر کو دبا لیا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔

پلنگ پر ابھی وہ ہچکولے ہی کھا رہی تھی کہ اُس کے اندر سے آواز آئی ''اگر وہ نہیں مانیں گے تو......''

اُس نے جھٹ تصویر کو منہ کے سامنے لایا اور ایک ادا سے پوچھا ''کیا آپ میری بات نہیں مانینگے؟''

اس کے خیال میں قریشی صاحب کے متبسم ہونٹوں پر جنبش سی آگئی اور وہ اپنے آپ کو لیٹے لیٹے رندانہ جنبش دے کر بولی۔ بتاؤ نا، کیا آپ میری بات نہیں مانیں گے؟''

ارے! آج تمہاری یہ ادائیں دیکھ کر کون تمہاری بات ماننے سے انکار کرے گا''۔

''میرے اچھے یار!'' اس نے تصویر کو ایک بار اور چوم لیا اور کہا ''مجھے یقین تھا۔ آپ ایسا ہی کہیں گے''۔

''اگر آج تم مجھے قتل کرنے کے لئے بھی کہوگی تو کون ظالم انکار کر سکے گا۔ تم ہی بتاؤ؟''

دیکھئے آپ قتل کی بات کرتے ہیں''۔ اس نے کسی قدر روٹھے پن سے کہا۔ ''میں نے کتنی بار کہا ہے۔ اُسے سزا سے بچاؤ، وہ بے چاری نردوش...... نہیں وہ غریب ہے''

''......خیر چھوڑ دوان باتوں کو، پہلے مجھے یہ تو بتاؤ آج یہ شام ڈھلے میک اَپ، یہ سولہ سنگار، یہ ناز و نخرے یہ سب کس لئے ہو رہے ہیں''

''آپ نہیں جانتے''۔ اس نے نئی نویلی دُلہن کی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا ''ایک مرد جب اپنی بیوی سے کوئی بات منوانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تو وہ ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی سے بھی کام لیتا ہے۔ مگر ایک عورت جب کوئی بات اپنے شوہر سے منوانے کی متمنی ہوتی ہے تو وہ صرف پیار سے کام لیتی ہے اور ناز و ادا سے...... سمجھے؟''

''اچھا تو یہ بات ہے؟''

''ہاں بات تو یہی ہے۔ لیکن اب آپ میری بات مانو گے نا؟''

آپ کو اپنے پیار کے دریا میں اپنے شوہر کو ڈبو کر اس کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیئے''۔

''میں کس مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہوں''۔

''کیا یہ ناجائز فائدہ نہیں کہ تم مجھے حاجرہ کو سزا سے بری کرنے کے لئے مجبور کر رہی ہو میں وثوق سے کہتا ہوں اگر حاجرہ کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو میں اس بات پر ضرور غور کرتا، لیکن...... اگر میں نے اُس کے بارے میں ایسا کیا تو لوگ کیا کہینگے''۔

''کیا کہینگے لوگ؟'' اس نے تصویر کو ذرا جھٹک دیا۔

''میں مجبور ہوں۔''

''مجبور......!'' اس نے جھٹ پلنگ پر اٹھ بیٹھ کر کہا۔ گھڑی گھڑی اپنی مجبوری جتاتے ہو اور میری مجبوری......دفعتاً اس کا دل دھڑک اُٹھا اور مایوسی وخجالت کی ملی جلی کیفیت اُس کے چہرے سے عیاں ہوئی۔

اچانک اس کے ہاتھ سے تصویر گر گئی، بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ جسم بے سدھ سا ہو گیا۔ اور وہ ایک گھمبیر آہ بھر کر اپنے آپ کا جائیزہ اس طرح لینے لگی گویا وہ کسی شدید واقعہ کا شکار ہونے والی تھی۔

یکا یک اس کی جنس زینت اور پیار کے دریا میں ایک طلاطم پیدا ہوا جو اسے غیرت، وقار اور عزت کے ساتھ ڈبونے لگا......مگر وہ ہاتھ پاؤں مار کر کنارے پر آنے کی بجائے لہروں کی آغوش میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پلنگ پر سے اُتر کر دیوار کے سامنے آئی اور تصویر کو اپنی جگہ ٹانک کر کچھ ہوچنے لگی......نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی کہ قریشی صاحب کی آمد سے وہ یک سر بدل گئی۔ وہ جلدی جلدی آگے بڑھی اور دروازہ کھول کر راہداری میں آئی۔

قریشی صاحب جتنا ہی اس کے نزدیک آرہا تھا اتنا ہی وہ آئینے کے سامنے کھڑے اور پلنگ پر لیٹے ہوئے ماحول کی درمیانی کیفیت میں ایک ساتھ الجھ اور سلجھ رہی تھی۔ قریشی صاحب نے جو اسے اس حال میں دیکھا تو وہ کسی قدر حیران ہوا۔ مگر بغیر کچھ کہے پوچھے سیدھا اندر آیا اور کپڑے بدلنے لگا۔

''آپ اس وقت تک کہاں تھے۔ دیر کیوں ہوگئی؟'' اُس نے پوچھا۔

''اپنا ہی کچھ کام تھا۔'' اس نے قدرے لاپرواہی سے جواب دیا۔ اس لاپرواہی کے پس منظر کو جھانک کر اسے اپنے تمام حربے زایل ہوتے دکھائی دیئے پھر بھی وقفہ بھر بعد متانت سے بولی ''حاجرہ آئی تھی۔ اب تک آپ کا انتظار کر رہی تھی''۔

''کیا کرنے آئی تھی؟''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے''

''تم نے کیا کہہ دیا؟''

''میں کیا کہہ دیتی، آپ نے میری بات کیا مانی ہے''

''مجھے اس کے بارے میں غور کرنا پڑے گا''

''اب کب تک غور کرینگے۔ کل تو فیصلہ ہے''۔

''اچھا!'' اس نے گویا چونکتے ہوئے کہا۔ حالانکہ پچھلی سماعت میں اُنہوں نے ہی فیصلہ کی تاریخ مقرر کی تھی۔

مسز قریشی نے پوچھا۔ ''کیا آپ کل فیصلہ کو ملتوی رکھیں گے؟''

''اس پر بھی غور کرنا پڑے گا۔

''خیر جب بھی فیصلہ سنا دینگے۔ اس کو بَری کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ کیونکہ میں نے اُسے وعدہ دیا ہے''۔

مجسٹریٹ تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور پھر صوفہ پر بیٹھ کر اندیشناک انداز میں بولا ''مگر میں نے بھی اُسے سزا دینے کا وعدہ دیا ہے''

''کس کو دیا ہے؟'' اس کی آواز میں پریشانی مترشح تھی۔

'' قانون اور انصاف کو!'' انہوں نے کھڑے ہو کر تبسم ہونٹوں سے کہہ دیا۔ بیوی کے تیور دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور اس کے دوش پر اپنے ہاتھ رکھ کر اسے اس طرح کن آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ گویا وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں اس سے کہہ رہا تھا...... کیوں ناراض ہوگئی!۔

مسز قریشی اسے ملتجائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ عالی جاہ کے تیور دیکھ کر وہ گویا نڈھال ہو کر اپنا سر اس کی چھاتی پر رکھ کر بولی۔

''کیا آپ میری بات نہیں مانیں گے؟!''

''تمہاری بات کون ظالم نہیں مانے گا'' اُس نے اپنے بازو اُس کے گرد حایل کر

کے زور سے اُسے بھینچ لیا۔

وہ مسحور کُن لہجے سے بولی ''مجھے آپ سے یہی توقع تھی''۔

''مگر مجھے تم سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی'' قریشی صاحب نے اُسے اپنی گرفت سے چھوڑ کر سیدھا کھڑا کیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر نہ جانے کیا دیکھنے لگا۔ مسز قریشی اس کا مطلب بالکل سمجھ نہ سکی۔ کیونکہ وہ اس لمس کی کیفیت سے کچھ شاد اور کچھ ناشاد ہو رہی تھی۔

مجسٹریٹ مقدمہ کی فایل کا مطالعہ کر رہا تھا...... وکلا اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے۔ مجرمہ حاجرہ کٹہرے پر کھڑی، واقعات پر غور کرنے کے ساتھ وہ حالت کو بھی جھانک رہی تھی۔ اسے مسز قریشی کے وعدے پر جتنا بھروسہ تھا۔ اتنا مسز قریشی کو اپنے شوہر پر وشواس نہیں تھا۔ جس کی بنا پر وہ ایک مکمل الجھن و فکر میں گھل رہی تھی۔ آج اُسے اس بات کا پورا پورا احساس ہو چلا تھا۔ اگر میں بری بھی ہو جاؤں گی پھر بھی میری عزت پر جو دھبہ لگ گیئے۔ وہ ایسا دھبہ ہے جو مجھے زندگی بھر ملامت کرتا رہے گا۔ اب وہ اس بھروسے پر آگے بڑھ رہی تھی کہ اگر مجھے سزا سے بری کیا گیا تو میں آہستہ آہستہ اس دھبہ کو دھو ڈالوں گی مگر ساتھ ہی وہ یہ سوچنے کے لئے بھی مجبور ہو رہی تھی۔ اگر مجھے کوئی سزا دی گئی تو نہ صرف میں انصاف کی پول کھول دوں گی بلکہ وعدے کے پرکھچے بھی اڑا دونگی۔

یکا یک مجسٹریٹ نے فایل پر سے نگاہیں ہٹا کر مجرمہ کی طرف دیکھا مجرمہ نے نہ جانے اُس کے چہرے پر کیا دیکھا کہ وہ ایک دم بدل گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کٹہرے کو زور سے پکڑ لیا۔

کٹہرے کو زور سے پکڑ کر اس نے اپنے ارد گرد بے اختیار و بے چین ہو کر کچھ اس طریقے سے دیکھا گویا اس وقت زلزلہ ہو رہا تھا۔ جو زلزلہ ایک قیامت بپا کر

رہاتھا......اس قیامت میں وہ اکیلی ماری ماری پھر رہی تھی۔ اسے اپنے اور پرائے کہیں

بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ غربت اس پر تازیانے لگا رہی تھی۔

اسوقت اسے نہ صرف ان سب باتوں کا پورا احساس تھا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو اس کی ذمہ دار بھی ٹھہرا رہی تھی۔

اُس کا ذہن واویلا کر رہا تھا۔ ضمیر ملامت کر رہی تھی۔ روح کانپ رہی تھی۔ اور دل تڑپ رہا تھا۔

اس نے جو کچھ بھی کیا تھا۔ وہ اچھی طرح کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

اس نے بے صبری سے سارے ہال کا جائیزہ لیا اور قریب قریب ہر ایک چہرے پر اپنی نگاہیں پھیلا کر اس طرح دیکھنے لگی۔ گویا وہ انہیں کہہ رہی تھی۔ "تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو......کچھ بھی نہیں"۔

مجسٹریٹ تھوڑی دیر کے لئے بحثیت محمد اکرم قریشی مجرمہ کے بجائے حاجرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حاجرہ کے اس وجود میں اس وقت اسے اپنی بیوی کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ جو اُسے بری کرنے کے لئے سب کچھ داؤ پر لگا چکی تھی۔

مجسٹریٹ کے چہرے پر اس وقت جو الجھن عیاں تھی۔ وہ سفارش اور انصاف کی ایک ٹکر تھی۔ جس ٹکر میں کبھی انصاف کامیاب ہو رہا تھا۔ اور کبھی سفارش فتحیاب ہو رہی تھی۔

"مجرمہ کے خلاف چوری کا الزام......!" مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا "شہادت اور گواہوں کے بیانات کے بعد مجرمہ نے بغیر کسی دباؤ کے اپنے جرم کا اقبال کیا ہے......"

"مے لارڈ!" مجرمہ کے منہ سے ایک گھمبیر آواز نکلی۔

مجسٹریٹ نے مجرمہ کے چہرے پر قہر آلود نگاہیں دوڑائیں اور کہا......اس لئے عدالت مجرمہ کو تعزیرات ہند کے دفعہ ۲۳۰ ب کے تحت تین مہینے کی سزائے قید دیتی ہے......عدالت برخاست ہوتی ہے"۔

کٹہرے پر سے اتر کر جب وہ دو سپاہیوں کے درمیان گردن جھکائے آہستہ آہستہ چلدی تو اُس نے مڑ کر ایک بار ہال کی طرف دیکھا نہ جانے وہ کب تک اسی طرح اس ہال کو دیکھتی رہتی کہ ایک سپاہی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ ایک آہ بھر کر چلدی۔

اس کے سامنے بھروسہ دھوکا بن چکا تھا۔ جب وہ برآمدے کی سیڑھیاں اُتر گئی تو اُس کی نظر اپنے پتی سلطان پر پڑی جو تیزی سے اُس کی طرف آرہا تھا۔

جب وہ اُس کے سامنے کھڑا ہوا تو جیب سے ایک کاغذ نکال کر اُس کو دینے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" حاجرہ نے دلگیر لہجے سے پوچھا۔ مارے شرم کے وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

"یہ تمہارے کرتوت کی سند ہے"۔ آج سے تم میری بیوی نہیں ہو، میں نے تمہیں طلاق دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جیل سے چھوٹ کر تم اپنے حق کا دعویٰ کر سکتی ہو، اتنا کہہ کر وہ یہاں سے چلدیا۔

چوری کی سزا اور طلاق کی اطلاع آج اس کے لئے دونوں غیر متوقع تھے وہ حواس کھو بیٹھی۔

مسز قریشی کو جب حاجرہ کے سزا کی اطلاع مل گئی تو اس کی حالت ایسی ہوگئی گویا اسے اپنے کسی خاص آدمی کے مرنے کی خبر مل گئی تھی۔ اس غمناک خبر میں جو ڈر اور خوف پنہاں تھا۔ اس سے وہ ہرگز بے خبر نہیں تھی۔

مسز قریشی کو حاجرہ کے ساتھ ایسا لگاؤ نہیں تھا جو ایک سہیلی کو سہیلی کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اُسے بہت چاہتی تھی۔ لیکن اس چاہت میں ایک غرض ضرور وابستہ تھی۔ اس لئے کہ حاجرہ اس کے پڑوس میں رہ کر ہمیشہ اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ اس کے ہاں برتن مانجھنے کپڑے دھونے، بچوں کو سنبھالنے میں کوئی آر یا ہتک نہیں سمجھتی تھی۔

حاجرہ کی شادی کو بارہ سال ہو چکے تھے۔ اس کا پتی سلک فیکٹری میں ملازمت کر رہا تھا۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ شادی کے بارہ سالوں میں حاجرہ

چار بچے جنی تھی۔ دو بچے اسے خوشی و مسرت کے ساتھ داغِ مفارقت بھی دے گئے تھے۔ دو بچوں کی موت نے اسے مکمل طور دارفتہ بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت ساعت مغموم و دلگیر رہا کرتی تھی۔ اسے اپنا یہ گھر بار ایک زندان خانہ دکھائی دے رہا تھا۔ حاجرہ غریب اور تنگدست ضرور تھی مگر وہ نوکری کو ہتک سمجھتی تھی۔ لیکن پڑوسن کے ناطے وہ وقتاً فوقتاً قریشی کے ہاں ضرور جاتی تھی۔ جہاں مسز قریشی اس سے ہمدردی جتا کر برابر ایک نوکرانی کا کام لے لیتی تھی۔

اس طرح ایک دوسرے کے قریب رہ کر نہ صرف وہ ایک دوسرے سے مانوس ہو گئی تھی۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کی رازدار بھی تھیں۔

رفتہ رفتہ جب حاجرہ سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہنے لگی تو مسز قریشی ہر ایک جگہ جہاں بھی اُسے جانا ہوتا اپنے ساتھ لے لیتی تھی۔ اگرچہ کسی تقریب یا دعوت پر وہ اسے اپنے ساتھ ایک نوکرانی کی غرض سے لے لیتی تھی۔ لیکن حاجرہ کے سامنے وہ ایسا ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی اور نہ ہی کبھی حاجرہ ان باتوں کی طرف کوئی دھیان دیتی تھی۔

آج سے چند مہینے پہلے مسز قریشی نے اسے اپنے ساتھ مجسٹریٹ کے ایک قریبی دوست کے ہاں دعوت پر لیا تھا۔ جہاں مجسٹریٹ کے دوست کی بیٹی کی دو چوڑیاں اور ایک ریسٹ واچ باتھ روم میں بھول کر غائب ہوگئی تھیں۔ لیکن مسز قریشی نے جب دیکھا حاجرہ کی طرف انگلیاں اُٹھ رہی ہیں۔ تو وہ حاجرہ کے ساتھ واپس اپنی کوٹھی پر آگئی تھی۔ اس واقعہ کے کئی دنوں بعد حاجرہ کے پاس قریشی کے ہاں کھوئی ہوئی ریسٹ واچ دیکھی گئی تو دیکھتے ہی دیکھتے پولیس نے اُس کے گھر پر چھاپہ مار لیا تھا۔

مجسٹریٹ قریشی اپنے بنگلے کے برآمدے میں پریشان ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا گویا وہ ایک آزمائش کے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ جہاں اسے کنارے کے بجائے صرف لہروں اور موجوں میں سکون مل رہا

تھا۔

وہ بے چینی سے کچھ اس طرح ٹہل رہا تھا۔ گویا اسے یہ گھربار اُجاڑ سا لگ رہا تھا۔ جب سے وہ حاجرہ کو سزا دے چکا تھا اس کی بیوی اس سے نہ صرف روٹھی تھی بلکہ وہ پشیمان اور غمگین نظر آ رہی تھی۔

حاجرہ کے بارے میں سپرنٹنڈنٹ جیل کا بیان مجسٹریٹ کو کسی بھی جگہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اُس وقت اسے رہ رہ کے اس کی یاد آ کر ستا رہی تھی۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رُک گیا۔ لیکن دوسرے لمحے آگے بڑھا اور کوٹھی کے اندر آ کر اپنی بیوی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مسز قریشی نے ایک نظر ڈال کر جونہی منہ پھر لیا تو اُس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا ''تم نے کچھ سن لیا ہے؟''

''قریشی صاحب کا لہجہ دیکھ کر اس کے چہرے سے حیرت و گھبراہت کی لہر سی دوڑ گئی۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھ لیتی۔ مجسٹریٹ بولا۔

سنٹرل جیل کے زنانہ وارڈ میں حاجرہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ تین مہینے کے بجائے صرف تین دنوں کے بعد!''

مسز قریشی بھونچکا سی رہ گئی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہا گیا۔

مجسٹریٹ کچھ اور بتلا رہا تھا کہ اُس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا

''اب پچھتا کیوں رہے ہیں...... آپ نے میری بات کب مانی''

مجسٹریٹ نے جواب دیا'' میں اس کے لئے پریشان نہیں ہوں اور نہ ہی حاجرہ کی موت کی خبر سن کر پچھتا رہا ہوں''۔

''پھر کیوں...... کس بات پر......؟'' وہ قدرے ہکاتے ہوئے بولی مجسٹریٹ نے متاسفانہ انداز میں جواب دیا۔

''صرف اس بات پر پچھتا رہا ہوں اگر اسے مرنا ہی تھا۔ تو پوری سزا کاٹ کر وہ کیوں نہ مر گئی''۔

''ہائے اللہ!'' مسز قریشی غلطاں و پیچاں ہو کر بولی ''آپ سزا کے لئے پچھتا رہے ہیں۔ کتنے سنگدل بن گئے ہیں آپ!''

''میں قانون اور انصاف کی نظر میں بھی سنگدل بن رہا ہوں۔ مگر تمہارا قانون و انصاف کا نکتہ جدا جدا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اگر قانون و انصاف نے مجھ سے حاجرہ کو تین مہینے قید کی سزا دلائی تو صرف تین دن سزا کے بعد اُسے کیوں اس دُنیا سے اٹھا لیا گیا۔ اگر وہ کسی اور سزا یا جزا کی مستحق تھی جو اُسے آخرت میں ملنے والی تھی تو تین مہینے کے بعد ایسا کیوں نہیں کیا گیا۔ اب سزا کیسے پوری ہو سکتی ہے۔ اور کون یہ سزا پوری کر سکتا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے میں پھر ٹہلنے لگا۔ بیوی نے تھوڑی دیر کا سکوت توڑ کر پوچھا ''مرنے سے پہلے اُس نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟''

''ہاں!'' ایک جا ٹھہر کو بولا ''سپر نٹنڈنٹ جیل کے بیان کے مطابق اُسے پوری سزا بھگتنے سے پہلے مرنے کا بہت دُکھ ہے۔

''عجیب قسم کی عورت ہے وہ!'' بیوی بے معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا مجسٹریٹ فیصلہ کن لہجے میں بولا ''ایسی عورت کی پرستش کرنی چاہیے'

جبھی تو آپ نے اُس کو سزا دی

''یہ سزا ابھی پورا کرنی ہے'' قریشی بیوی پر غصیلی نظریں دوڑا کر بولا۔

عدالت کے کٹہرے پر سپرانٹنڈنٹ جیل کے اس بیان کے بعد کہ حاجرہ نامی جس مجرمہ کو تین روز قبل سزا سنائی گئی تھی۔ اُس نے خودکشی سے قبل چوری کی جو تفصیلات دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے اُس نے دوسرے کی عزت بچانے کی خاطر اس جرم کو قبول کر لیا تھا۔

سپر نٹنڈنٹ جیل کے بیان کے بعد مجسٹریٹ نے مقدمہ کی فائل کو بغور دیکھا پھر فائل پر سے نگاہیں ہٹا کر سارے ہال میں منتشر کیں اور پھر یہی منتشر نگاہیں مجرمہ کے

چہرے پر سمٹ لیں۔

''مجرمہ کے خلاف چوری کا الزام......مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا......عدالت میں برحق ثابت ہوا ہے اور عدالت اس نتیجہ پر پہنچی ہے جس نتیجہ پر عدالت اپنے عدل سے کام لے کر یہ ثابت کر سکتی ہے۔ عدالت ہمیشہ انصاف کا دامن تھام کر کسی بھی مقدمہ کی پیروی کرتی ہے، یہاں رشتے ناطے کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ چاہیے وہ جج کی بیوی کیوں نہ ہو''

مجسٹریٹ کی زبانی ایسا سنتے ہی سارے ہال میں مسرت لی لہر سی دوڑ گئی۔ یکا یک مجرمہ کے جسم میں ایک کپکپاہٹ پیدا ہو گئی، اس نے جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے کٹھرے کو زور سے پکڑ لیا۔

مجسٹریٹ نے کہا'' عدالت کی طرف سے مجرمہ پر ایک دباؤ ضرور ڈالا گیا ہے۔ مگر اس دباؤ کے بغیر مجرمہ آسانی سے اپنے جرم سے پردہ نہیں ہٹا رہی تھی''

''مے لارڈ!'' مجرمہ نے دلگیر لہجے سے پکارا۔ مجسٹریٹ نے اُس کے چہرے پر ہمدردانہ نگاہیں گارڈ دیں اور اسی انداز سے پوچھا'' مجرمہ کیا کہنا چاہتی ہے؟''

''مم......میں......کچھ نہیں''

مجسٹریٹ مقدمہ کی فائیل پر نظر ڈال کر بولا'' مجرمہ پر جو چوری کا الزام عاید کیا گیا ہے۔ مجرمہ کی طرف سے اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس لئے عدالت مجرمہ کو دو مہینے ستائیس دن قید کی سزا دیتی ہے......'' مجرمہ پر جو چوری کا الزام لاگو ہو گیا۔ اس کی سزا تعزیرات ہند کے دفعہ ۱۲۳ (ب) کے تحت پورے تین مہینے سزائے قید ہو سکتی تھی۔ لیکن تین مہینے میں حاجرہ نامی مجرمہ تین دن کی سزا بھگت چکی ہے۔ اس لئے باقی سزا کے لئے مجرمہ مسز قریشی مستحق قرار دی گئی ہے......عدالت برخاست ہوتی ہے؟

ٹوٹے آئینے کی پرچھائیاں

اُس کی بیوی نے اُس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی تھی۔

پہلے تو بیوی کی بات سن کر اُس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔لیکن دوسرے لمحے اس پر غور کر کے وہ ایکدم کھڑا ہو گیا۔اور بیوی کے گال پر ایک زور سے تھپڑ مارا، اُس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔آنکھیں اُبل رہی تھیں۔اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی بوٹی بوٹی نوچ لے۔ساری دنیا کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے۔

آج صبح سے ہی وہ بہت پریشان تھا، اُس کی اکلوتی بیٹی جب اُسے اخبار دینے آئی تو اُسے لگا کہ وہ تو جوان ہو چکی ہے۔ان میں جوانی کا نکھار آچکا ہے۔وہ اخبار ہاتھ میں لئے خبریں پڑھنے کے بجائے سوچتا رہا کہ یہ بڑے اندیشے کے دن ہوتے ہیں۔ذرہ سی چوک ہوئی اور پاؤں پھسلا تو...... بلکہ کبھی کبھی تو ایسی جوانی میں خود بھی پھسلنے کو جی چاہتا ہے۔بیٹی کے خیال میں وہ بہت پریشان ہوا، وہ ٹھیک سے اخبار بھی نہ پڑھ سکا۔اخبار کے اوراق پر اشتہارات کے کالموں میں نیم عریاں لڑکی میں اسے اپنی بیٹی کا عکس نظر آیا تو وہ مضطرب سا ہو گیا۔

اُس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ ناشتے کے بعد وہ اپنی بیوی سے بات کرے گا۔اور دونوں مل کر یہ طے کریں گے کہ بیٹی پر کتنی پابندیاں لگائی جا سکتی ہے اور کتنی آزادی دی جائے کہ وہ گھبرائے بھی نہیں اور بھٹکنے بھی نہ پائے۔

آخر تو وہ بڑی خوبصورت تھی اور جوان بھی۔

اسی دوران ان کی نظر اخبار کی ایک خبر پر پڑی تو وہ کانپ سا اُٹھا، پہلے اس کے دل

میں خدشتہ سا پیدا ہو گیا تھا اب وشواس ہونے لگا کہ اُس کی بیٹی کے قدم اب تک غلط راستے پر نہ پڑے ہوں نہ سہی، لیکن ان کا پھسل جانا طے ہے۔

وہ تڑپ اُٹھا اور ہیجانی کیفیت میں بڑبڑانے لگا کہ وہ کس طرح اپنی بیٹی کو پاپ کے دلدل کی طرف جانے سے روکے؟ پاپ کی دلدل میں اس کا جانا اب اُس کے خون میں رس بس گیا ہے۔

وہ اخبار پھینک کر اس انداز سے کھڑا ہو گیا گویا اُسے ابھی ابھی بیٹی کے ایکسڈنٹ کی خبر ملی ہو۔

چند ماہ قبل کا حادثہ اس کی آنکھوں سامنے گھومنے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس روز اُس کی بیٹی کالج جا رہی تھی راستے میں تیز دوڑتی ہوئی ایک کار سے ٹکرا کر لہولہان ہو گئی اور ہسپتال تک پہنچتے پہنچتے اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے فوراً خون دینے کے لئے کہا تھا۔ مگر اپنوں میں سے کسی کا بھی خون اُس کے خون کے گروپ کے ساتھ نہیں مل سکا تھا۔ یہ صورت حال ماں باپ کو سخت پریشان کر رہی تھی کہ اتنے میں اسی ہسپتال کی ایک نرس نیلوفر خون دینے کے لئے سامنے آ گئی تھی۔ اُس نے اپنا خون ٹیسٹ کروایا تو نتیجہ سن کر اُس نے خوشی خوشی اپنے خون کی زبیدہ کے لئے پیش کش کی تھی۔ اس کی یہ پیش کش زبیدہ اور اُس کے والدین پر اس وقت ایک احسان سے کم نہ تھا۔ نیوفر کے سامنے اس ہسپتال میں کتنے ہی ایکسیڈنٹ کے کیس آتے ہوں گے۔ لیکن بھولی بالی زبیدہ کی جوانی اور حسن پر رحم کھا کر اُس نے پہلی بار اپنے خون کا دھان دیا۔ زبیدہ کے والدین کے سامنے اس وقت نیوفر ایک فرشتہ بن کر آئی تھی۔ اور ان کی بیٹی کو جان بچانے میں مددگار بنی تھی۔

نیوفر نے اپنا خون دینے کی کوئی قیمت یا تحفہ بھی نہیں لیا تھا اور نہ ہی کوئی احسان جتایا تھا۔ نیوفر کے اس اقدام کی ہسپتال کے ڈاکٹروں اور عملے نے خوب تعریفیں کی تھیں۔ ان کی شرافت انصاف پسندی کی سراہنا بھی کی گئی تھی۔ ایسے وقت میں جب زبیدہ کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا نیوفر کے خون کی پیش کش سے زبیدہ کے باپ کے دل

میں نیلوفر نے گھر کرلیا، نیوفر کو اس نے اپنی دوسری بیٹی کا سماں دیا۔ عبدالرحمٰن کا خیال تھا اس دنیا میں جب تک نیوفر جیسی عورتیں اور مرد موجود ہیں۔ یہاں انسانیت قائم ہے۔

چند ماہ قبل کا یہ خیال آج اس کے سامنے متزلزل ہوا، اس نے اخبار دوبارہ ہاتھ میں لیا، دوبارہ خبر کو پڑھ لیا تو اس کا بدن کانپ اٹھا، آج اور ابھی اس کی نظروں میں انسانیت اور شرافت پر نہ صرف آنچ آئی تھی بلکہ یہ سب ایک سیلاب میں ڈوب گئے ہیں۔ آج ساری عورتوں پر سے اُس کا وشواس اٹھ گیا ہے۔ جس نیوفر کو وہ آج تک ایک مثالی لڑکی سمجھتا تھا، وہ لڑکی آج ایک پاپ کی مورت تھی۔ کیونکہ اُسے سیکس سکنڈل میں ملوث پاکر گرفتار کرلیا گیا تھا۔ تصویر کے ساتھ یہ خبر آج کے اخبار میں آئی تھی۔

اخبار میں آج نیلوفر کا اصلی روپ کھل چکا تھا۔ نیلوفر کی اس بدکاری اور بدچلنی کی خبر سے عبدالرحمٰن کو بڑا دکھ اور افسوس ہوا، مگر اس سے بھی زیادہ دکھ اُسے نیلوفر کے اُس خون کا ہوا جو آج اس کے جوان بیٹی کے جسم میں موجود ہے۔

ایک بدکار بدچلن لڑکی کے خون سے اس کی بیٹی کیسے بچ سکے گی، یہی پریشانی اسے لاحق ہوگئی بیٹی کے بارے میں خدشات نے اسے ایسا گھیر لیا کہ وہ ناشتہ کرنا ہی بھول گیا۔

بیوی اسے بلانے آئی تو پتی کی حالت دیکھ کر وہ گھمبیر ہوگئی۔ اُس نے کتنی بار اپنے پتی سے پریشانی کے بارے میں پوچھا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا اور وہ اس کے قریب آکر شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے بولی۔

"آپ پریشان کیوں ہیں۔ بات کیا ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے......؟ تمہیں میری جان کی قسم بتا دیجئے نا، کیا بات ہے۔ مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی، ایسی کیا بات ہے، جو تم مجھ سے چھپاتے ہیں"

"دیکھو مجھے تنگ مت کرو، جاؤ اپنا کام کرو!" وہ بیوی پر برس پڑا۔

"آپ کو میری قسم، مجھے بتاؤ تو سہی، میں بھی تو جانوں بات کیا ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟

"تم کیا جانو گی خاک......! میں کہتا ہوں اس دُنیا میں عورتوں کا بیڑہ ہی غرق ہو

جائے تو وہ بھی کم ہے۔

"کیوں......؟ تم آج عورتوں پر اس قدر ناراض کیوں ہو؟" اس کی آواز میں پریشانی چھلک رہی تھی۔

اس لئے کہ عورتوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ وہ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ ہوتی ہیں۔"

"آج آپ یہ کیا کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا ہوا تمہیں؟

"مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں کیسی باتیں کر رہا ہوں، مگر آج مجھے باتیں کرنے دو، مجھے چیخنے اور چلانے دو مجھے ساری عورتوں کے ظاہر اور باطن کی دھجیاں اڑانے دو!"

"یہ کیا کہہ رہے ہو، کیا ہوا تمہیں؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں وہی کر رہا ہوں اور وہی کہہ رہا ہوں جو تم سن رہی ہو، آج میں عورت ذات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم پوچھتی ہو کہ میں آج پریشان کیوں ہوں۔ اگر تم میری پریشانی کا اندازہ کرو گی تو تمہیں پتہ چلے گا کہ آج اس وقت مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹی کو جان سے ہی مار دوں!

"کہ...... کیوں، کیوں مارو گے اُسے اُس نے......

شوہر نے اس کی بات کاٹ دی "اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس کا کوئی قصور بھی نہیں۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات کچھ بھی ہو، مگر مجھے اس بات کا پورا ڈر ہے اگر زبیدہ پر کڑی نظر نہیں رکھی گئی اگر اس کے گھومنے پھرنے کی آزادی پر قدغن نہیں لگائی گئی تو اُس کے قدم بہک سکتے ہیں۔ وہ بھی پھسل جائے گی، میرا یہ ماننا ہے کہ وہ بھی عورت سے گر جائے گی، وہ بدچلن بن جائے گی، اس لئے کہ اس کی رگوں میں ایک ایسی عورت کا خون دوڑ رہا ہے جو بدچلن ہے۔ اس کے جسم میں ایک ایسی عورت کا خون موجود ہے جو اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے غیر مردوں کے ساتھ جنسی میل رکھتی ہے۔ لعنت ہے ایسی عورت پر لعنت ہے......

عبدالرحمن کہے جا رہا تھا۔ اتنے میں اس کی بیوی ایک دم اس کے پاؤں پڑ گئی شوہر

کے دونوں پاؤں پر اپنا سر رکھ کر روتے ہوئے بولی۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے، اب کی بار مجھے بخش دیجئے، اگر آپ نے پھر کبھی میری ایسی کوئی بات سن لی تو آپ مجھے جان سے مار دیجئے، لیکن آج مجھے معاف کر دیجئے" وہ سسکیاں بھر کر اور آنسو بہا کر شوہر کے قدموں پر معافی مانگ رہی تھی۔ پہلے تو اس کے شوہر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ جب اس کی معافی پر غور کر لیا تو...... اسے دونوں ہاتھوں سے کھڑا کیا اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر مار کر خود صوفہ پر گر پڑا۔

❀❀❀

......اور میں مر گیا

میں نہ جانے کن خیالات میں گم سُم تھا۔ البتہ اتنا جانتا تھا کہ میں اس وقت بلیوارڈ کی طرف جار ہا ہوں۔ بوچھوارہ سے بلیوارڈ کی مصافت زیادہ نہیں۔ جب میں بلیوارڈ پر پہنچا تو میری نظر نیلی رنگ کار پر پڑی، میں رک گیا، میرے سارے بدن میں جلن سی محسوس ہوئی۔ چہرے سے ہوائیاں جیسی اُٹھنے لگیں، دیکھتے دیکھتے ہی یہ کار نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ رشید خود اس کار کو چلار ہا تھا۔

ان کے دونوں بچے اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ شاید یہ اپنے بچوں کو کانوینٹ سکول چھوڑنے جار ہا تھا۔ کیونکہ دونوں بچے وردی میں ملبوس تھے۔

رشید اپنے بچوں کو لے کر شاید کانوینٹ سکول پہنچ گیا ہوگا البتہ میں......، میں حسد کی آگ میں سراپا جل سا گیا۔ میری ایسی بُری حالت ہوگئی کہ میں نے اسی وقت خودکشی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ البتہ دوسرے لمحے میں اس ارادے سے باز آیا......؟ ہاں! یہ خیال ضرور آیا میں پہلے اُس شخص کو دیکھ لوں جو سچ مچ خودکشی کرنے نکلا ہو، میں اُسے کچھ بھی نہیں کہتا البتہ اُسے پکڑ کر اُس کا شکم چاک کر لیتا، اس کا دل کھول کر دیکھ لیتا کہ اس میں ایسی کونسی خاصیت ہے جو یہ خودکشی پر بالکل آمادہ ہے۔ پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ جبکہ میرا دل بار بار صرف ارادہ کر لیتا ہے عمل نہیں۔ جب جب میں نے خودکشی کا ارادہ کرلیا میرا دل گھبرانے لگا اور میں نے خود کو طعنہ دیا۔ بزدل! کہیں کا۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا، میں نے کتنی بار خود کو مارنے کا ارادہ کرلیا مگر ہر بار بزدلی آڑے آئی۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ وہ بھی مجھ جیسے ہی لوگ ہیں جو میری طرح زندگی سے تنگ آکر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں اور اپنے ارادوں پر کار بند رہ کر اونچی

اونچی منزلوں سے کود جاتے ہیں۔ گاڑی کے نیچے آجاتے ہیں یا دریا میں ڈوب کر مرتے ہیں۔ زہر بھی کھا لیتے ہیں اور خود کو پھانسی بھی دیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو یقیناً دل والے ہیں۔ ارادوں کے پکے ہیں نڈر اور بہادر بھی ہیں۔

ان کے مقابلے میں، میں بڑا ہی ڈرپوک نکما اور بزدل ہوں، حالانکہ میں اس دنیا سے تنگ آچکا ہوں، میری زندگی میرے لئے وبال جان ہے۔ اس بے مروت اور بے درد دنیا میں جینے کے لئے مجبور کون مجھے کر رہا ہے۔ کیوں کر رہا ہے؟ اگر میں اسے دیکھ لوں تو اس کو میں قتل کر لوں گا اور اس کی بوٹیاں نوچ لوں گا۔ پھر دیکھ لوں گا کون مجھے مرنے سے روکے گا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب بلیوارڈ کے پاس جھیل ڈل کے اس کنارے پر ڈونگے میں راشن گھاٹ ہوا کرتا تھا۔ اور میں یہاں سے راشن کارڈ پر راشن لانے آرہا تھا اور اگر میں آرہا تھا تو رشید اپنی کار میں یہاں سے کیوں جا رہا تھا۔ اب اگر اُسے جانا ہی تھا تو میری نظر اُس پر کیوں پڑی۔

اگر نظر پڑی تو جلن کیوں ہوئی۔ میرا سراپا حسد میں کیوں ڈوب گیا۔ میرے جیب میں راشن کے لئے ادھار لئے جو روپے تھے ان کو میں نے زور سے پکڑ لیا۔ اور سوچنے لگا مجھے بار بار راشن کے لئے ضروریات زندگی کے لئے ادھار کیوں لانا پڑتا ہے۔ مجھے غربت نے کیوں گھیر لیا ہے۔ مجھ میں آخر کیا کمی ہے؟

رشید میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ عقل کا کچا اور تعلیم میں کمزور لگاتار تین سال تک میٹرک میں فیل ہو کر پڑھنا چھوڑ دیا، میں پہلے ہی سال پاس ہو کر ایف اے کرنے کے بعد کلرک بنا، شادی ہوئی دس سال میں پانچ بچے ہوئے بوڑھے ماں باپ کا اکیلا سہارا بنا، مہنگائی کے دور میں تنخواہ کی ناکافی نے مشکلات میں مبتلا کر دیا۔

رشید کی مالی حالت کمزور تھی۔ وہ ہینڈی کرافٹ کی ایک فرم میں ملازم ہوا، سال بھر سرینگر میں رہنے کے بعد مالک نے اسے ممبئی کی اپنی فرم میں سیلز مین کی حیثیت میں بھیج

دیا، ایک ڈیڑھ سال تک بمبئی میں نوکری کرنے کے بعد اُس نے اپنا الگ کاروبار کرنا شروع کیا وہ سرینگر آکر مال لیجاتا اور بمبئی میں فروخت کر کے واپس آجاتا، اسی آوٴ جاوٴ میں دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نشاط میں زمین خرید لی، پھر بنگلہ بنایا، ایک امیر گھرانے میں شادی رچائی، یہاں انہیں ڈھیر سارا جہیز اور پڑھی لکھی بیوی مل گئی۔ جہیز میں اسے نیلی رنگ کی کار بھی ملی۔

اس نیلی کار میں جب بھی میں نے اسے آتے جاتے دیکھا مجھے خود سے نفرت ہونی لگی، مجھے لگا میں ایک بیکار شئے ہوں۔ اور بے وقعت جاندار، اگر خود کو بے مقصد جانور بھی کہوں وہ بھی ٹھیک رہے گا۔ رشید نے اس دوران جب بھی میری طرف دیکھا یہی تاثر دیا میں آپ کو اچھی طرح جانتا نہیں۔ حالانکہ سکول میں کلاس فیلو ہی نہیں قریبی دوست بھی تھا ہم ایک جان دو قالب جیسے تھے۔ چنانچہ ابھی ابھی جب وہ نیلی رنگ کی کار میں جارہا تھا اور جونہی میری اس پر نظر پڑی میری حالت غیر ہوگئی حسد کی آگ نے سرتاپا مجھے جلسا دیا۔ میں ایک آہ بھر کر رہ گیا اور خود سے نفرت کرنے لگا۔ اس بات پر کہ میں نے زندگی میں سوائے پریشانی کے اور حاصل کیا کیا؟ ہر ماہ قرض لے کر خود کو مقرروض بنا دیا۔ نہ بیوی کی اور نہ ہی بچوں کی فرمائش پورا کرسکتا ہوں۔ بوڑھے ماں باپ کی ادویات کے لئے بھی جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ اگر سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بجائے میں نے بھی کسی فرم میں ملازمت کر لی ہوتی۔ اگر مجھے بھی بمبئی جانے کا موقع ملا ہوتا اگر میں نے بھی سرینگر سے چرس لے کر وہاں فروخت کیا ہوتا تو آج میری بھی حیثیت رشید کی جیسی ہوتی۔

رشید کی یاد کے ساتھ میں سڑک کراس کر کے فٹ پاتھ پر آیا جھیل ڈل میں ہاوٴس بوٹوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔ پانی میں شکارے تھرک رہے ہیں۔ ہاوٴس بوٹوں اور شکاروں میں سیلانی اُس کشمیر کی خوبصورتی کا حظ اٹھا رہے ہیں۔ جو کشمیر مجھے صرف بدصورت دکھائی دے رہی ہے۔ مجھے اس میں کوئی حسن دکھائی نہیں دیتا، بھلا جو ادھار

جس کے پیسوں سے راشن لانے گھاٹ پر آیا ہو، وہ جل پری کہاں ہو سکتا ہے۔ جس کے دن آہ و زاری میں گزر رہے ہوں اور راتیں صرف کروٹیں بدل بدل کر بسر کرنا پڑ رہی ہوں۔ اُس کو ڈل کے یہ نظارے کاٹ کھانے کو نہ آئیں تو کیا کریں۔

اور اس وقت جب ڈل کے یہ نظارے مجھے کاٹ کھانے لگے تو میں نے ڈل کے پانی میں کود کر زندگی کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ پلک جھکنے کے ساتھ کر لیا، دوسرے لمحے میرا یہ ارادہ پختہ ہو گیا۔ قبل اس کے میں پانی میں چھلانگ مار دیتا خیال آیا میرے پاس قرض کے جو یہ روپے ہیں یہ بھی میرے ساتھ ضائع ہو جائیں گے، میری لاش تو کسی کام کی نہیں ہو گی۔ البتہ یہ روپے کسی کے کام ضرور آسکتے ہیں۔ اگر کوئی حاجت مند اس وقت یہاں سے گزرتا تو میں یہ سارے روپے اس کے حوالہ کر دیتا، یا کوئی بھکاری ہی مل جاتا تو اس کو یہ ساری رقم دیدیتا، وہ بھی کیا یاد کرے گا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا تو البتہ اپنی بیوی بچے نظروں کے سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھ بوڑھے ماں باپ کی یاد بھی آ گئی۔

مجھے ایک دم خیال آیا میرے مرنے سے میرے گھر بار کا آخری سہارا بھی چھوٹ گیا تو وہ کیا کریں گے کیسے جئیں گے۔ ان کی زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی۔ لہذا مجھے...... مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں، میں بیوی، بچوں اور ماں باپ کی یاد میں ششدر سا ہو گیا، میں بغیر کسی آؤ تاؤ دیکھے گھر کی جانب دوڑ پڑا، سڑک کراس کرتے ہی میں نے دیکھا نیلی رنگ کی کار آ رہی ہے۔ شاید رشید واپس آ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ میں اس کار سے ٹکرایا سڑک پر گرتے ہی میں دوسری جانب آنے والی گاڑی کے نیچے آ گیا۔ میں نے محسوس کیا میں مر رہا ہوں۔

جب مرنا چاہا نہیں مرا بزدلی آڑے آئی اور جب جینا چاہا اپنے بوڑھے والدین کے لئے بیوی بچوں کے لئے تو مارا گیا۔ اور میں مر گیا۔

سُہاگ اور شعلے

خاموش، میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔
میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں اور اس کے بعد مجھ سا برا اور کوئی نہیں ہوگا۔
''تم اپنی حیثیت دیکھ لو، تم جیسی لڑکی اگر مجھے مُفت بھی ملتی۔ تب بھی میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ تم کو یہ جاننا چاہیے، تمہارے ساتھ شادی کرتے ہوئے میں نے تم پر اور تمہارے خاندان پر احسان کیا ہے...... اگر آج اِس کے صلے میں مجھے تمہاری طرف سے یہی جواب ملا'' وہ خاموش ہوا۔ لیکن فوراً خشونت سے بولا ''تم تو یہ اچھی طرح سے جان لو اِس طرح تم میری چاہت اور میری رائے کو ٹھکرا رہی ہو، مگر تم یہ بھول رہی ہو کہ ایسا کرتے ہوئے تمہیں ایک ایسی ٹھوکر کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جو ٹھوکر ایسی سخت ہوگی کہ تمہیں عمر بھر یاد رہے گی...... سمجھی؟''
اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور اس کے چہرے پر قہر آلود نگاہیں دوڑا کر یہاں سے چلدیا۔ نہ جانے کہاں اور کدھر؟
اس کے جاتے ہی وہ سر تھام کر بیٹھ گئی اور اس انداز سے بیٹھ گئی گویا وہ ابھی سے ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہی تھی۔ وہ اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ چھوٹی بہن کے جیون پر آنسو بہا رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔
''کیا میں اپنی چاہت کا گلا گھونٹ کر اُس کی چاہت کو بھر لاؤں گی؟ لیکن نہیں!''
اِس کا دل ڈوبنے لگا۔
''کیا میں ایک ایسی ٹھوکر کھاؤں گی جس سے...... مگر نہیں!''

وہ لرز گئی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟"

اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

اب وہ مرنا چاہتی تھی لیکن سکون سے وہ مر نہیں سکتی۔ اسے اپنے ساتھ چھوٹی بہن کی زندگی کے سارے ولولے، ارمان اور تمنائیں ڈوبتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔ اور اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"کیا ہر مرد کسی عورت کے ساتھ شادی کر کے اس پر اور اس کے خاندان پر احسان کرتا ہے اگر وہ غریب گھرانے کی ہو......؟ اس نے ہمیں اتنا نیچ کیوں سمجھ رکھا ہے؟ وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے، بحیثیت ایک شوہر کے وہ مجھ پر اس قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتا۔ لیکن......ایک بیوی کی حیثیت سے کیا مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر وہ......"

یکا یک اِس کے تن بدن میں ایک ہیجان سا بپا ہو گیا۔ وہ جذباتی بن کر اپنے آپ سے بولی۔

"اگر اُس نے میری چاہت پر اپنی رائے کو ترجیح دی تو......تو مجھے قربانی دینی پڑے گی!"

قربانی کی عکاسی کرتے ہوئے یکا یک اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ سے نکل گئی۔ یہ چیخ اس کی چھوٹی بہن کے جگر کے پار کر گئی۔ جو چولہے میں لکڑی گھسیڑتے ہوئے شعلے بھڑکا رہی تھی۔

وقعتاً چولہے پر پڑے پتیلے میں اُبھال کا جوش آیا اور جھاگ آگ پر پڑ گئی۔ دھواں اور بھاپ اِس کے جسم سے ٹکرایا اور جسم......، وہ ایک حادثہ سے گھبرا گیا۔

اِس گھبراہٹ میں وہ اپنے آپ سے بولی۔

"کیا میں اپنے آپ کو اس کے سپرد کروں گی جس کو......لیکن نہیں!؟"

وہ سخت پریشان ہوگئی۔

''کیا میں ان سبھوں کو چھوڑ کر یہاں سے بھاگ جاؤں گی......؟ مگر نہیں''

اس کی عزت تحقیر ہونے لگی۔

کیا وہ بڑی بہن کو کہہ دے گی۔ تم ٹھوکر کھانے سے کیوں ڈرتی ہو۔ لیکن نہیں!!''

اس کا سر چکرانے لگا۔

''تو پھر میں کیا کروں!''

اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے کو بھیگی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ شفقت اور محبت کا تصادم ہو رہا تھا۔

ایک سہاگ اُجڑ رہا تھا۔

ایک زندگی پروان چڑھ رہی تھی

ایک چاہت مٹ رہی تھی

ایک تمنا پوری ہو رہی تھی

اور قربانی......!!

وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔

بڑی بہن اٹھ کر چھوٹی بہن کے پاس آئی اور اس کے آنسو پونچھ کر اسے سہلانے لگی۔ وہ جانتی تھی۔ نہ صرف یہ اس کی بڑی بہن ہے بلکہ اس کی ماں بھی ہے۔ باپ اور بھائی بھی ہے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد جب ان کا بھائی پاکستان چلا گیا۔ تو یہ دونوں بے سہارا ہو کر ایک دوسرے کے لئے جینے لگیں۔ بہن نے اپنے آپ کو علی محمد کے پلے باندھا تو وہ اپنے ساتھ چھوٹی بہن کو بھی یہیں لائیں، کیونکہ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ جس کے پاس وہ اپنی چھوٹی بہن کو رکھتی۔ آج دونوں بہنیں اس وقت ایک دوسرے کی قسمت پر رو رہی تھی۔ اور ایک دوسرے کو تسلی دے رہی تھیں۔ چھوٹی بہن کی آنکھوں

سے آنسوؤں کی دھار جا رہی ہوئی تو بڑی بہن سے رہا نہیں گیا اور اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا یا۔

"زبیدہ......! تم رو رہی ہو، کیوں؟ میں تیرے لئے زندہ ہوں۔ میں تمہاری زندگی کو برباد ہونے نہ دوں گی، وہ آئے گا تو میں اُسے ضرور مناؤں گی!"

"اگر وہ نہیں مانے؟"

"میں اُسے مجبور کروں گی"

"اگر وہ اپنی اکڑ پر ڈٹے رہے"

"تو میں تمہارے جیون بھر کی خوشی کے لئے اپنے سہاگ کو قربان کروں گی، میں آوارہ، جواری اور شرابی دیور کے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گی۔ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ چاہیے اس کے لئے مجھے..........." نہ جانے آگے وہ کیا کہنے والی تھی کہ پیچھے سے علی محمد کی غضبناک آواز سنائی دی۔

"چاہے اس کے لئے مجھے سخت سے سخت ٹھوکر کیوں نہ کھانا پڑے، یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟"

دونوں بہنیں کھٹکے سے چونک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں کہ وہ ان کے قریب آکر بیوی سے مخاطب ہوا۔

"کیا یہی تمہارا آخری جواب ہے"

"غیر ارادی طور پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ علی محمد غصہ ہو کر بولا۔

"تو پھر تم بھی میرا آخری سوال سُن لو۔ اور مجھے سوچ سمجھ کر جواب دو......" اگر تمہیں یہاں میری بیوی بن کر رہنا ہے۔ تو اپنی چھوٹی بہن کی شادی میرے بھائی کے ساتھ کرنا مان جاؤ۔ اگر تم نے اب بھی انکار کیا تو.........."

یکا یک ایک دھماکہ سا ہوا، انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے، زندگی ہچکولے کھانے لگی۔

"بڑی بہن چھوٹی بہن کے جیوان کو برباد ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی، مگر اس

کے لئے اسے اپنے سہاگ کی قربانی کی ضرورت تھی۔

چھوٹی بہن، بڑی بہن کے سہاگ کو اجڑتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی......مگر اس کے لئے اسے زندگی کو برباد کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک آوارہ بدچلن اور بدمعاش کے پلے باندھنا پڑ رہا تھا...... دونوں بہنیں ایک دوسرے کے لئے قربانی دینے کے لئے تیار تھیں۔ اور قربانی......وہ کروٹ پر کروٹ لے رہی تھی۔

علی محمد ان دونوں کے درمیان جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ چھوٹی بہن نگاہوں ہی نگاہوں میں بڑی بہن سے مخاطب ہوئی۔ "باجی" تم پریشان کیوں ہو رہی ہو، میں اپنے جیون کو تمہارے لئے تیاگ دے دوں گی۔ میں زندگی بھر کے دکھ برداشت کروں گی اور صبر و برداشت کو تمہارے سہاگ پر قربان کروں گی۔

"نہیں۔ نہیں!! بڑی بہن نے اشارے سے تعرض کیا۔" میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، میں اپنے سہاگ کو تمہاری چاہتوں اور خوشیوں کے لئے قربان کروں گی"

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا" علی محمد نے دونوں کا مطلب بھانپ کر پوچھا، اس کی بیوی نے بھرائی آواز میں کہا......

"کیا جواب دوں گی؟"

دیکھو، تم ہٹ دھرمی سے کام لے رہی ہو، اس طرح تمہیں چھوٹی بہن کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی!"

"کچھ بھی ہو میں اپنی چھوٹی بہن کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گی"

ایسا سنتے ہی وہ غصہ سے شرابور ہوا اور بولا۔

"میں بھی تمہارے پیچھے پڑ کر اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔ تم یہاں سے جا سکتی ہو اسی وقت جا سکتی ہو!" اور اپنی چھوٹی بہن کو بھی لے جا سکتی ہو۔

خاموش۔ میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا، میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں اور اس

کے بعد مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا......تم سوچ لو میں نے تمہیں سہارا دیا۔ میں نے تمہارے ساتھ تمہاری بڑی بہن کو بھی اپنا لیا۔ اگر اس کے صلے میں مجھے تمہاری طرف سے یہی جواب ملا تو......تم اس بات کو نوٹ کرلو اپنی آئندہ زندگی کے لئے تم یہ بُرا بیج بوتی ہو۔

تم یہ کیوں بھول رہی ہو اگر میں نے تمہارے ساتھ شادی نہیں کی ہوتی تو آج تمہاری کیا حالت ہوتی؟ تمہارے بہنوئی نے اپنے آوارہ بھائی کے ساتھ تمہاری شادی کر دی ہوتی......تم کو اپنا کر میں نے تمہاری بری بہن کا ساتھ دیا۔ تمہارے ساتھ ساتھ میں نے تمہاری بڑی بہن پر بھی ایک احسان کیا، لیکن پھر بھی تم نے میرا مشورہ نہیں مانا، تم نے میری چاہت کو ٹھکرا دیا، یہ جان کر بھی کہ اس طرح تمہیں ایک ایسی ٹھوکر کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جو ٹھوکر ایسی سخت ہوگی کہ تمہیں عمر بھر یاد رہے گی!''

اتنا کہہ کر وہ بیوی کے چہرے پر قہر آلود نگاہیں دوڑا کر یہاں سے چلدیا......نہ جانے کہاں اور کدھر؟!

اس کے جاتے ہی وہ بھونچکا سی رہ گئی۔ اور اس انداز سے رہ گئی گویا وہ ابھی سے ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہی تھی۔ وہ اپنی قسمت کو رو رہی تھی، اپنی بڑی بہن کی زندگی پر پچھتا رہی تھی اور سوچ رہی تھی،

''کیا میں اُس کا مشورہ مانوں گی......؟ لیکن کیسے؟''

وہ پریشان ہوگئی۔

''کیا میں ایک ایسی ٹھوکر کھاؤں گی جس سے......مگر نہیں!!''

وہ لرز سی گئی۔

''کیا میں باجی کو اس بات کے لئے مناؤں گی۔ نہیں، نہیں؟''

وہ ششدر رہ گئی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟''

اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

اب وہ مرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ سکون سے مر نہیں سکتی، اسے اپنے ساتھ بڑی بہن کی زندگی کے سارے ارمان ڈوبتے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ رو رہی تھی اور من ہی من میں کہہ رہی تھی۔

"کیا ہر مرد عورت کے ساتھ شادی کر کے اس پر کوئی احسان کرتا ہے......؟ اس نے ہمیں اتنا ذلیل کیوں سمجھ رکھا ہے؟ کیا میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگر ہے تو پھر وہ...... آگے وہ کچھ بھی سوچ نہ سکی۔ لیکن وہ فوراً جذباتی بن کر اپنے آپ سے مخاطب ہوئی۔

اگر اس نے میری چاہت پر اپنی رائے کو ترجیح دی تو......تو مجھے قربانی دینی پڑے گی۔

قربانی کی عکاسی کرتے ہی یکا یک اس کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ جس کو سن کر اس کی بڑی بہن لرزسی اٹھی۔ جو چولہے مین آگ سلگا رہی تھی۔ کشیف دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے، اور اس کے جسم کے ساتھ ٹکرار ہے تھے۔

دفعتاً شعلے بھڑک اُٹھے،

دھوئیں کی تاریکی اور شعلوں کی چمک سے وہ گھبرائی اور گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی...... وہ دوڑتے دوڑتے چھوٹی بہن کے پاس آئی اور گلو گیر آواز میں بولی۔

"بہن۔ مجھے بچاؤ، ورنہ میں...... میں کہیں کی بھی نہیں رہ جاؤں گی۔

"باجی......! تم کیوں رو رہی ہو، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ آنے دو اسے میں اسے مناؤنگی"

"اگر وہ نہیں مانے تو؟"

"اس صورت میں تم خود ہی فیصلہ کرلو"

"کیا۔ کون سا فیصلہ؟" بڑی بہن ششدر سی ہوگئی۔ چھوٹی بہن کچھ سوچ کر بولی

"میرے خیال میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں تمہارے لئے ٹھیک کر رہے ہیں۔"

"بڑی بہن یہ سُن کر ہکا بکا سی رہ گئی۔

چھوٹی بہن بولی۔ میری مانو تو اپنے شوہر سے طلاق لے کر میرے دیور کے ساتھ بیاہ کرنا مان جاؤ۔ بے چارے کی بیوی حال ہی میں مر گئی ہے، دو چھوٹے بچے چھوڑ گئی ہے"۔

ایک بار ایک دھماکہ سا ہوا، بڑی بہن کے وجود پر بجلی سی گری، وہ سراپا کانپ گئی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن وہ کہہ نہیں سکی، چھوٹی بہن اس کا مطلب بھانپ کر بولی

"باجی میں اُس بہنوئی کے لئے اپنے سہاگ کو نہیں اُجاڑ سکتی۔ جس نے ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ جس نے ہمیں اپنے گھر سے نکال دیا......تم اس گھر میں واپس کیسے جا سکتی ہو، چاہیے وہ تمہیں واپس آنے کے لئے اپنے آدمی بھیج رہا ہے۔

"بہن، وہ جیسا بھی ہے میرا سر تاج ہے۔ میں اُس کی ہوں اور وہ میرا ہے"۔

"اگر تمہارا یہی خیال ہے تو پھر تمہیں اس کے پاس جانا چاہیے، آج وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ کہیں کل خود ہی جانا نہ پڑے۔

"اچھا تو یہ بات ہے"

"ہاں، تمہیں اپنی آئندزندگی کے بارے میں آج ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ تم دیکھ رہی ہو، ہم کس طرح سکونت کرتے ہیں۔ ہم میاں بیوی کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ جن کو ہمیں کچھ اس طرح پورا کرنا ہے کہ کوئی ہمارا شریک نہ ہو، کوئی ہمارے ساتھ نہ ہو، یہ تو تم خود بھی جانتی ہو!"

ایسا سنتے ہی بڑی بہن ششدر ہو کر رہ گئی وہ دم بخود ہو گئی وہ رو پڑی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر یہاں سے چلدی، نہ جانے کہاں اور کدھر؟

شام کب کی ہو چکی تھی، یکا یک اس کے کانوں میں قدموں سے چلنے کی آوازیں

آ ئیں۔ معاً اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس کے چہرے پر سرخ اور گرم لہر سی دوڑ گئی اور وہ ہوش شکن انگڑائی لیکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے لپک گئی اور بازو پھیلا کر اپنے شوہر کو سینے کے ساتھ چمٹ گئی۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' اس نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

''بڑی بہن چلی گئی، اب ہمارے سوا یہاں کوئی نہیں ہے''

''اچھا چلی گئی، نہیں مانی وہ میری بات''

''ہونہہ، میرا سکھایا اب مجھ کو ہی سکھانے لگے، یعنی میری بلی مجھ سے ہی میاؤں۔ وہ سائے کی طرح یہاں ہمارے پیچھے لگی رہتی

ہاں! یہ بات تو ہے''

''چھوڑ دو اب اس کی باتیں...... چلو آؤ!

''پہلے کھانا کھانے دو......'' اتنی جلدی کیا ہے۔

اور کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد وہ بے صبر، بے اختیار اور بے چین نظروں سے اسے گھور رہا تھا اور وہ...... وہ آرزومند نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔

سہاگ نکھر رہا تھا۔ شعلے بھڑک رہے تھے

دونوں آج ایک ساتھ بستر بچھا رہے تھے۔

بستر بچھانے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے تھے

اور اس طرح ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے گویا اُس کا سایہ ابھی انکا پیچھا کر رہا تھا۔

شریف بدمعاش

آپ مجھے ایک پتھر ماریئے۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میں نے جس کسی کو بھی پتھر مارنے کے لئے کہا اس نے مجھے پاگل سمجھا، میں سچ کہہ رہا ہوں میں پاگل نہیں......، اگر میں پاگل ہوتا تو میں کسی پر پتھر مار کر اپنا مقصد برلایا ہوتا، کیونکہ اس نے مجھ سے ایک ایسا پتھر مانگا ہے جو کسی نے بھی کسی پر مارا ہو۔ ایسا پتھر وہ بھی ہوسکتا ہے جو میں کسی پر ماروں گا۔ مگر میں نہیں چاہتا ایک عورت کی خاطر کوئی میرے ہاتھ سے زخمی ہو جائے......آپ کا رنگ تبدیل کیوں ہوگیا؟ آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسا کرنے کے لئے میں آپ کو مجبور کر رہا ہوں۔ میں آپ کی منت سماجت کر رہا ہوں! آپ مجھے پتھر ماریں گے تو اتنی زور سے نہیں مارنا کہ میں مر ہی جاؤں، خون نکلے تو اس کی آپ فکر نہ کریں، حالانکہ میرے جسم کے کسی حصے پر خون دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر سکے گی اس لئے کہ وہ بڑی رحمدل ہے۔ ہمارے سامنے تو بظاہر یہ ایک معمولی پتھر ہے مگر وہ اسے ایک قیمتی ہیرا سمجھتی ہے۔ ایسی بات نہ ہوتی تو وہ مجھ سے کیونکر کہتی تم مجھے یہ پتھر لا کر دو گے تو میں سمجھوں گی تم نے مجھے ایک دنیا لا کر دی ہے۔ آپ کی طرح پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ کتنی عجیب عورت ہے۔ مگر اس کے قریب رہ کر مجھے یہ بخوبی پتہ چلا وہ ہرگز عجیب نہیں البتہ سادہ اور معصوم ضرور ہے۔

آپ جانتے نہیں اس کے دل میں درد، پیار اور اپنا پن بھرا ہوا ہے۔ ایسی عورت مشکل سے ملتی ہے۔ مگر میرے بڑے بھائی کو، جو مجھ سے علیحدہ رہتا ہے......وہ بڑی

آسانی سے مل گئی۔

مجھے معلوم ہے وہ ایک روز میرے بڑے بھائی کے ہاں کچھ مانگنے آئی، جسے بھیک بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن اس طرح نہیں جس طرح عام بھکارنیں مانگتی ہیں۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ جس کے لئے وہ زبان سے نہیں بلکہ آنکھوں سے کچھ مانگ رہی تھی۔ میرا بڑا بھائی "جو بظاہر بڑا ظالم تھا" کسی پر ترس کھانا جانتا ہی نہیں تھا اور جو انصاف، سچائی اور ہمدردی سے مبرا تھا، اس کی زبان سے اس کا ماضی سن کر موم کی طرح پگھل گیا۔ ان دنوں اس عورت کو بیوہ ہوئے چند ماہ ہو چکے تھے۔

میرے بڑے بھائی نے اُسے اپنے ساتھ شادی کرنے کے لئے کہا جس کو وہ کچھ لیت ولعل کے بعد مان گئی۔ شادی کے موقعے پر اس نے میرے بڑے بھائی سے بھی یہی ایک پتھر مانگا جو آج وہ مجھ سے مانگ رہی ہے۔ میرے بھائی کو یہ پتھر ڈھونڈ نے سے بھی کہاں ملتا، اس نے چھپ کر ایک اجنبی پر ایک پتھر مار کر اُسے لا کر دیا تھا۔ جس کو اس نے چند دنون کے بعد فضول چیز جان کر پھینک دیا تھا۔

اگر مجھے معلوم ہوتا میرے بڑے بھائی کی موت کے بعد مجھے اُسی سے شادی کرنا پڑے گی اور شادی کے لئے وہ ایسے ہی ایک پتھر کی شرط رکھے گی تو میں انہی دنوں اس پتھر کو محفوظ رکھتا۔ آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں، وہ عورت میری بھابی ہے اور بھابی کے ساتھ شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ اول تو اس میں کوئی اعتراض نہیں، دوسرے میں کسی اور جگہ شادی بیاہ کر کے ڈھیر سارے روپے خرچ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میرا اتنا گذراہ نہیں۔ چونکہ یہ عورت اچھی ہے، خوبصورت ہے، عمر میں مجھ سے بڑی ضرور ہے، لیکن صرف ایک پتھر میں ملتی ہے۔ اس کو بھی میرے ساتھ شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ایسی عورت کو حاصل کرنے کے لئے اگر سب کچھ داؤ پر لگایا جائے تو وہ بھی کم ہے۔ مگر اس کی نیت دیکھو وہ زر وزیور اور پوشاک وغیرہ کے بدلے صرف ایک پتھر مانگتی ہے...... آپ میری طبیعت کا اندازہ کیجئے میں کتنا نرم دل، دردمند اور نیک ہوں۔ اگر

میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ بڑے بھائی کی طرح سنگدل اور ظالم ہوتا تو آتے ہی کسی پر پتھر مار کر میں نے اپنا مقصد پورا کرلیا ہوتا اور اب تک اس عورت سے شادی کر چکا ہوتا۔

آپ کہنا چاہتے ہیں وہ کتنی ظالم عورت ہے جو شادی کے لئے ایسی شرط رکھ کر دوسروں پر ظلم کرواتی ہے۔ لیکن اگر آپ اُسے دیکھیں گے تو آپ بھی یہ ماننے کے لئے تیار ہوں گے کہ ایسی عورت ہرگز ظالم نہیں ہوسکتی...... آپ کو معلوم نہیں جب اس نے مجھے یہ پتھر لانے کے لئے بھیجا تو اس نے مجھے پورا ایک گلاس دودھ کا پینے کے لئے دیا تھا مگر میں نے صاف صاف کہدیا جب تک میں تمہیں تمہارا قیمتی ہیرا نہیں لاکر دوں گا۔ میں تمہارے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاؤں گا، کچھ نہیں پیوں گا...... کہنے کو تو میں نے یہ سب کہدیا مگر کچھ دیر بعد اس کی نظریں بچا کر میں اس میں سے تھوڑا سا دودھ پی کر آیا۔

اب میں واپس جارہا ہوں۔ وہ میرا انتظار کررہی ہوگی۔ آپ اپنا کام کیجئے۔ اگر آپ اس طرح نہیں کرسکتے تو آنکھیں بند کر کے کیجئے، میں وہاں پر کھڑا ہوتا ہوں۔

تمہارے ماتھے پر یہ کیسا خون ہے......؟ شاید تم نے مجھے جو یہ پتھر لاکر دیا ہے کسی پر مارنے کے بجائے اپنے آپ پر مارویا ہے۔ اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو پھر تم ہی وہ شخص ہو جس کی مجھے اب تک تلاش تھی۔ مجھے یقین ہے تم ہرگز ظالم و جابر نہیں بلکہ نیک اور درد مند ہو۔ تم تو اپنے بڑے بھائی سے بالکل مختلف ہو۔ میں تمہاری طبیعت سے پہلے ہی واقف تھی مگر میرا خیال تھا تم دونوں ایک ہی والدین کے ہو اسلئے تم دونوں کی فطرت میں مماثلت ضرور ہوگی مگر ایسا نہیں ہے۔

تم میرے شوہر بننے کے قابل ہو۔ میں شادی کروں گی تو صرف تم سے...... تم تو جانتے ہو میرا ایک سرتاج تھا۔ جس سے یہ بچہ ہوا ہے۔ وہ بے چارہ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ اس کی موت کا مجھے بہت دکھ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میں ازل ہی سے بدقسمت تھی کیونکہ زندگی

پھر میرا اس کا ساتھ نہ رہا۔ اس کی موت سے میں بالکل بے سہارا ہوگئی۔ اس کے سوا میرا کوئی اور نہیں تھا۔ جب میں در در کی ٹھوکریں کھانے لگی تو میں نے مرنے کا ارادہ کرلیا۔ مگر معصوم بچے نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ اس بچے کے لئے میں اپنے آپ کو کسی کے پلے باندھنا چاہتی تھی مگر اپنانے کے بجائے مجھے لٹانے کی دعوت دیجاتی تھی۔ میں عورت تھی نا...... بے کس و بے سہارا عورت!

اگر تم باور کرو گے تو میں نے اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر عورت کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ مشکل حالات میں بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ اس بھری دنیا میں اگر مجھے کسی نے بغیر کسی غرض کے انسانیت کے ناطے اپنایا تو صرف تمہارے بڑے بھائی نے جس کی موت سے میں ایکبار اور بے سہارا ہوگئی۔ تمہیں شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ میرا دوسرا شوہر نہیں بلکہ میری اولاد تھا...... اس نے میری اس چھاتی کا دودھ پی لیا تھا......! اس نے بھی مجھے یہاں ماں جان کر پالا۔

میری یہ باتیں سن کر تمہیں اچمبھا کیوں ہورہا ہے...... یہ سب حقیقت ہے......!

تم کو یاد ہوگا جب میں پہلی بار یہاں اس گھر میں آئی تو میری زبان سے میری جیون کہانی سن کر تمہارے بڑے بھائی کو کتنا دکھ ہوا تھا۔

میری برباد زندگی کی کہانی سن کر وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں بھیک مانگ کر اپنے آپ کو پالوں، اپنے آپ کو زندہ رکھوں...... اس نے مجھے اپنے ساتھ شادی کرنے کی دعوت دی جسے میں نے غور و خوض کے بعد قبول کرلیا اس لئے کہ ایک عورت جس کا کوئی سہارا نہ ہو کیسے زندگی گزار سکتی ہے۔ میں نے تمہارے بھائی کے بارے میں معلوم کرلیا تو کسی نے بھی مجھے اس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ سبھوں کا یہی کہنا تھا کہ وہ بڑا ظالم اور سنگدل ہے۔ اس کے بارے میں یہ بات بھی عام تھی کہ اس نے اپنی بیوی کو بہت اذیت دی تھی، اسے بہت دکھ دیئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ جان بحق ہوگئی...... تم ہی بتاؤ ایسی باتیں سن کر میں کیسے اس کے ساتھ نبھاہ کرسکتی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں سُنی سنائی

تھیں، اس لئے پہلے میں نے اس کی آزمائش کی۔ میں نے اس سے کہدیا اگر تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو تو مجھے ایک ایسا پتھر لا کر دو جو کسی نے بھی کسی پر مارا ہو۔ مجھے صرف یہ دیکھنا تھا کہ اگر اس نے میری خاطر کسی پر پتھر مار کر مجھے لا کر دیا تو وہ یقیناً ظالم ہوگا اور ایسے ظالم کے ساتھ میں بیاہ نہیں کروں گی

تم جاننا چاہتے ہوگے کہ پھر میں اتنی مدت تک اس کے پاس یہاں کیسے رہ سکی۔ تم کو باور کرنا پڑے گا اس کے پاس میں بالکل محفوظ رہی۔ دنیا کی نظروں میں ہم میاں بیوی تھے۔ مگر ہماری حیثیت ماں بیٹے جیسی تھی۔ تم نہیں جانتے جب میں نے اس کے سامنے شادی کرنے سے صاف انکار کیا تو اس نے مجھ سے کہا پھر تم ایک غیر مرد کے پاس یہاں کیسے رہ سکتی ہو، کیونکہ تم یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتیں۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا صرف دودھ کا ایک گلاس مانگا۔ اس دودھ میں، میں نے اپنی چھاتی کا دودھ ملا دیا اور پھر یہی دودھ اسے پلا دیا اور اس کے سامنے فخر سے کہدیا اب میں یہاں کسی غیر مرد کے پاس نہیں بلکہ اپنے بیٹے کے پاس رہوں گی! اس نے مجھے ماں کہہ کر پکارا اور مرتے دم تک ماں جان کر اپنایا۔ تمہارے بھائی کی موت کے بعد اب میں تمہارے ساتھ بھی اسی حیثیت سے رہنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے تمہیں بھی دودھ کا گلاس پیش کر دیا تھا۔ جس میں میں نے اپنی چھاتی کا دودھ ملا دیا تھا۔ اگر تم نے وہ دودھ پی لیا ہوتا تو میں تم جیسے شوہر کو کھو دیتی...... میری باتوں سے تم اتنے اُداس کیوں ہو گئے...... کیا بات ہے؟

تم بتاتے کیوں نہیں؟ مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو......؟ میں کوئی غیر نہیں، اب سے میں تمہاری ہوں، صرف تمہاری...... وہ اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کے چہرے پر اس کے اندر کا اضطراب نمایاں تھا۔ غالباً وہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا میں اپنے ظالم جابر بدمعاش بھائی کی طرح ماں کے دودھ کا احترام کروں یا......، سب کچھ بھول کر اسے بیوی بناؤں میں کروں تو کیا کروں، اگر میں اسے بیوی بناؤں گا تو میری شرافت پر بھٹہ

لگے گا۔ اگر بیوی نہیں بناؤں گا تو اسے کیسے پالوں گا۔ اس کا قرب حاصل کیسے کروں گا۔ مفت کا مال مل رہا ہے۔ اور وہ بھی راضی ہے۔

"تم کیا سوچ رہے ہو، کن خیالوں میں ڈوبے ہو؟، مجھے بتاؤ، اب سے میں تمہاری ہوں اور تم میرے ہو، ہم دونوں جیون ساتھی ہیں۔"

وہ اضطرابی کیفیت میں کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے پوچھے یہاں سے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ مسجد کے امام کے ساتھ پڑوس کے چار اشخاص کو ساتھ لایا اور نکاح کا اہتمام کیا۔

❁❁❁

حماقت

حماقت، حماقت......حماقت!

اڑوس پڑوس میں، پورے محلے میں، سارے علاقے میں اسی ایک حماقت کے چرچے ہیں۔اس پر جب پریس میں اس حماقت سے متعلق خبر آئی تو دور دور تک حماقت کی خبر پھیل گئی۔

جو بھی آیا، اس نے خورشید سے بس یہی کہا، یہ تم نے کیسی حماقت کی؟ اور کیوں کی؟ خورشید لاجواب ہے۔ اپنے رشتے میں پاس پڑوس میں قریب و جوار میں خورشید پر حماقت کے تیر برس رہے ہیں۔ گولے داغے جا رہے ہیں اور تو اور میزائیل آرہے ہیں۔اس سے حماقت بھی مجروح ہوگئی اور جس نے یہ حماقت کی اُس کا حال......بہت بُرا ہے۔وہ زندگی سے مایوس ہے۔وہ جینے سے بیزار ہے۔ وہ خود محسوس کرر ہا ہے۔ وہ لٹ چکا ہے۔اس کے جینے کا مقصد باقی نہیں رہا ہے۔ جو بھی اس کے پاس آتا ہے اس کی ڈھارس بندھانے اس کو تسلی دینے اور صبر سے کام لینے کے بجائے یہی ایک شکایت کرتا ہے۔تم نے یہ کیسی حماقت کی، مرد ہو یا عورت بوڑھا ہو یا جوان ہر کوئی ان سے شکوہ کرر ہا ہے۔تم نے یہ کیسی حماقت کی؟ تم کو یہ کیا ہوگیا، کیوں تمہاری عقل ماری گئی۔ کیا سوچ کر تم نے ایسا قدم اٹھایا۔ کیوں اتنے نادان بن گئے۔ کیوں ایسی حماقت کر بیٹھے؟

خورشید کسی ایک کو بھی اس کا جواب دینے کے قابل نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے پاس کسی ایک کے لئے بھی معقول جواب نہیں ہے۔

خود وہ اپنی اس حماقت پر سخت نادم ہے۔ وہ زخمی ہے۔ البتہ بے بس اور لاچار ہے۔ کیونکہ اب اس کا تدارک نہیں ہوسکتا، نہ بدلہ چکایا جا سکتا۔ خورشید اپنی نادانی پر رو رہا ہے۔ اپنی حماقت پر سخت پچھتا رہا ہے۔ اپنی اس حماقت پر اس کا دل کترا جا رہا ہے۔ اس کا کلیجہ مسوس رہا ہے۔ اس کا ذہن پراگندہ ہے۔ وہ اپنی سوچ پر ماتم کر رہا ہے۔

خورشید کے بارے میں ہمارا کہنا ہے۔

وہ اتنا ذہن تو نہیں تھا جتنا وہ خود کو سمجھتا اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتا، وہ خود کو بڑا تیس مار خان بھی مانتا اور اس زعم میں مبتلا تھا وہ بہت کچھ نہیں بلکہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسے ہر موضوع پر عبور حاصل ہونے کا زعم ہے۔ اس نے ملکی اور غیر ملکی دانشوروں، ادیبوں اور تنقید نگاروں کو پڑھا ضرور ہے، خود کچھ نہیں لکھا البتہ جب بھی لکھنے لگانے والوں کا ذکر ہوتا تو وہ اپنی ٹانگ ضرور اڑاتا، کسی محفل میں بیٹھا ہوتا تو خود کو صاحب محفل بنانے اور دوسروں پر رعب ڈالنے میں پیچھے نہیں رہتا، بڑے بڑے خواب دیکھنے اور ان کا اظہار کرنے میں پیش پیش رہتا، کسی لڑکی کے ساتھ اس کا کوئی معاشقہ نہیں تھا۔ البتہ لڑکیوں کے نام ''پتے'' کے بغیر گنا کر خود کو ایسا عاشق ثابت کرتا گویا درجنوں لڑکیاں اس پر مرمٹتی تھیں اور ان کا قرب حاصل کرنے کیلئے بے تاب رہا کرتی تھیں۔ عشق اور عاشقی کی من گھڑت کہانیاں ایسا سناتا کہ ان پر یقین کرنے کو جی چاہتا۔

بی اے کرنے کے بعد خورشید کو کافی تگ و دو کے بعد کہیں نوکری نہیں ملی،

البتہ وہ اکثر ہم جیسے یار دوستوں اور ساتھیوں کو بھی بتاتا نوکری میں کیا رکھا ہے۔ وہ بزنس کرنا چاہتا ہے وہ بڑا بزنس مین بننا چاہتا۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا وہ بڑا بزنس مین بن کر دکھائے گا۔ ایک روز خورشید اچانک لاپتہ ہو گیا۔ ان کے بچھڑنے سے واقعی ہماری محفل سونی ہو گئی۔ ہمیں احساس ہو گیا خورشید کے بغیر محفل کی رونق ماندھ پڑ گئی ہے۔ کافی ہاؤس میں ہمارا آپس میں ملنا ایک معمول تھا۔ کافی ہاؤس میں ہمارا ٹیبل مخصوص ہوتا، یہاں ہر وقت گزاری کے ساتھ مستقبل کے خواب دیکھنا کافی کی چسکی لینا اور پھر اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹنا ہمارا معمول تھا۔ اس معمول میں خورشید کی غیر حاضری نے خاصا اثر ڈالا۔

وہ جو کہتے ہیں ''تیری یاد آتی تیرے جانے کے بعد'' یقیناً ہمارے لئے ایسا ہی ہوا۔ خورشید کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، پتہ معلوم کیا تو ہمیں بتایا گیا خورشید بمبئی چلا گیا ہے وہاں کسی فرم میں کام کر رہا ہے۔

خورشید ڈیڑھ دو سال کے بعد گھر لوٹ آیا تو وہ یقیناً بالکل بدلا ہوا تھا۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا میرا بمبئی میں کشمیری شال ہینڈی کرافٹ کا بزنس ہے۔ البتہ وہ وہاں پر ایسی ایک فرم میں سلز منیجر کے پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔

کچھ بھی ہو خورشید اب بدل گیا ہے۔ البتہ بزنس کا انکا اپنا شوق پورا ہوا ہے۔ خورشید اب بیکار نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں ہمارے ساتھ کافی ہاؤس یا دوسرے ریستورانوں میں گھنٹوں بیٹھنے کی فرصت نہیں۔ جب بھی بمبئی سے سرینگر آتا ہے تو بڑی جلدی میں ہوتا ہے۔ اب ان کے پاس وقت کا حساب ہے۔

بظاہر خورشید سمیت ہم چھ لنگوٹیا یار تھے۔ البتہ خورشید زیادہ قریب میرے ساتھ رہا کرتے تھے۔ میرے راز دار بھی تھے۔ اگر یہ کہا جائے ان کے ہمارے درمیان گھریلو تعلقات بھی تھے۔ تو غلط نہیں ہوگا۔ خوشی اور دکھ میں ہمارے اور

خورشید کے گھر والے ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے۔ خورشید کے فیملی ممبران اگر ہمارے گھر آتے تو میرے فیملی ممبران ان کے گھر جاتے، اس طرح ہمارا آپس کا میل ملاپ مثالی تھا۔

خورشید کی شادی کے موقعہ پر ہماری ساری فیملی نے خورشید کے گھر میں کئی روز تک گویا ڈیرہ ہی جما لیا تھا۔

شادی کے فوراً بعد خورشید بہت بدل گیا۔ اگر یہ کہا جائے وہ بیوی کا غلام بن گیا تو غلط نہیں ہوگا۔ خورشید بیوی کے ساتھ ٹوٹ کر پیار کرنے لگا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ خورشید کی بیوی حسین گڑیا تھی البتہ خورشید کی چال ڈھال قد اور جسمانی ساخت ہیرو سے کم نہیں۔ خورشید اور ان کی بیوی کو ہیرو ہیروئین کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خورشید نے اگر اپنی بیوی سے ٹوٹ کر پیار کیا تو اس کی بیوی نے بھی اپنا حسن اور عشق اس پر گھویا نچھاور کر دیا۔ خورشید کی بیوی نے اپنے پتی کو بے حد پیار دیا چونکہ خورشید کو بزنس کے سلسلے میں زیادہ تر بمبئی میں رہنا پڑتا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کو آپس کی جدائی برداشت تو کرنا پڑتی۔ البتہ ایک دوسرے سے الگ رہنا ان کے لئے سوہان روح سے کم نہیں ہوتا۔ خورشید بیوی کو اپنے ساتھ بمبئی لے جا کر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن ان کے والدین ان کے بہن بھائی اس کے لئے راضی نہ تھے۔ خورشید بیوی کو لے جانے اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے گھر والوں کے ساتھ بغاوت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ خورشید کے ساتھ نہ جانے میں ان کی بیوی کا بھی عمل دخل رہا۔ کیونکہ وہ خود پر یہ الزام لگوانا نہیں چاہتی کہ وہ الگ گھر بسانے کی روادار ہے۔ کیونکہ وہ ساس سسر کو ماں باپ سمجھتی تھی۔ خورشید کی غیر حاضری میں جب مجھے ان کے گھر جانے کا موقعہ ملا، میں نے خورشید کی بیوی کو خورشید کی جدائی کا رونا روتے دیکھا، اپنے جیون ساتھی کی

جدائی کا زہر کے گھونٹ پیتے دیکھا۔

اُدھر خورشید کی لگ بھگ یہی حالت تھی۔

بمبئی میں خورشد جس فرم میں سیلز منیجر کے عہدے پر فائیز تھا۔ اس فرم کا مالک ائیر کریشن میں معجزاتی طور بچ گیا تھا۔ بیرونی سفر کے دوران انڈین ائیر لائینس کا جہاز گر کر تباہ ہوا تھا۔ اڑھائی سو سواریوں میں سے ایک سوانیس سواریاں موقعہ پر ہی ہلاک ہوئی تھیں۔ لگ بھگ باقی سبھی سواریاں زخمی حالات میں بچالی گئی تھیں۔ کسی کو شدید چوٹ آئی تھی تو کوئی مرہم پٹی کے بعد گھر بھیج دیا گیا۔ جن مسافروں کی حالت نازک تھی اُن کو مختلف ہسپتالوں میں بھرتی کرایا گیا۔ سرکار نے اس حادثے کی تحقیقات کرانے کا اعلان کیا۔ حادثے میں مرنے والوں کے لئے ایکسگریشیا ریلیف کا اعلان بھی ہوا۔

چونکہ خورشید کے مالک کو معمولی مرہم پٹی کر کے دوسرے جہاز سے بمبئی بھیجا گیا تو جب وہ اپنی رہائش گاہ پر آ گئے تو علاقے کے لوگوں نے ان کا بڑی گرم جوشی سے سواگت کیا، نیا جنم پانے کی خوشی میں ان کا ایسا استقبال کیا گیا جس طرح شادی بیاہ کے موقعہ پر دلہا کا کیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنی کوٹھی پر آ گئے تو ان پر نہ صرف پھول نچھاور کئے گئے بلکہ ان کی راہوں پر رنگین اور خوبصورت پھول بچھا کر رکھے گئے۔ ان کے گلے میں قسم قسم کے ہار ڈالے گئے۔ میوے اور مٹھائیوں کے ٹوکرے بانٹے گئے۔ نیا جنم پا کر اپنی کوٹھی میں داخل ہو کر ان کا ایسا سواگت اور استقبال کیا گیا۔ گویا کسی راجے کی تاجپوشی کا سماں تھا۔ ان کی جان بچ جانے پر انہیں مبارکباد پیش کرنے والوں کا دن بھر تانتا بندھا رہا۔ فیملی ممبران کے ساتھ یار برادری کے لوگوں نے ان کو گلے لگایا۔ صبح سے شام تک یہاں جشن کا سماں رہا۔ ائیر کریش میں بچ جانا یقیناً معجزے سے کم نہ تھا۔ جبکہ لگ بھگ سو سواریاں

موت کا شکار ہوئی تھیں۔ اس ائیر کریش میں جو بھی بچ گیا اس نے یقیناً نیا جنم لیا، نئے جنم پر مبارکبادی کا دور سواگت اور استقبال خورشید نے اُس کا اثر قبول کرلیا۔ اسے اچانک خیال آیا، اگر وہ بھی اس جہاز میں سوار ہوتا اور معجزاتی طور پر بچ گیا ہوتا، تو اس کا بھی سواگت ہوتا، اس کا بھی استقبال ہوتا، ان کے قدموں تلے پھولوں کا فرش ہوتا، اس کے سر پر پھول نچھاور ہوتے، ان کے معجزاتی طور پر بچ جانے پر میوے اور مٹھائیوں کے ٹوکریاں خیرات میں بانٹے جاتے انہیں بھی گلے لگایا جاتا۔

خورشید سوچنے لگا۔ ان کی شادی کے موقعہ پر ان کا جو سواگت کیا گیا ان کے ائیر کریشن میں بچ جانے پر اُس سے بڑھ کر سواگت اور استقبال ہو گا۔ انہی خیالوں میں کھو کر خورشید مالک کی جگہ پر خود کو پا کر استقبال قبول کرنے لگا۔ مبارکباد وصول کرنے لگا۔

دن بھر اس تقریب میں مصروف رہنے کے بعد ان کے ذہن میں استقبال، سواگت اور مبارکبادی ایسا گھر کر گئی کہ اگلے روز انہوں نے اپنے والد کو ٹیلی گرام بھیجوا دی، اس ٹیلی گرام میں ائیر کریشن میں خورشید کے مارے جانے کی خبر روانہ کی گئی۔ خورشید گھر والوں کو اپنے مرنے کی خبر بھیج کر اب انہیں سرپرائیز دینے کے لئے دوسرے روز سرینگر کے لئے ہوئی جہاز میں روانہ ہو گیا۔ تا کہ جب وہ گھر پہنچے گا تو وہاں ماتم اچانک خوشی میں بدل جائے گا۔ ان کے سواگت ہوگا انکا استقبال ہوگا۔ انہیں گلے لگایا جائے گا۔ ان پر پھولوں کے ساتھ خوشیاں نچھاور ہوں گی۔ ان کی معجزاتی طور پر جان بچ جانے کا چرچا ہوگا۔ انہیں مبارکباد دینے کا تانتا لگ جائے گا۔ وہ خبروں میں آئے گا۔ ان کے گھر والے ان کی شریک حیات المناک غم کو بھول کر! یکدم خوشی و مسرت کے سمندر میں غرق ہوں گے۔ ماتم شادمان میں بدل

جائے گا۔ ایک ایسا سماں بندھ جائے گا جو یکیفت سے تعلق رکھتا ہے۔

ٹیلی گرام کے ذریعے اپنی موت کا پیام بھیجنے کے 36 گھنٹے کے بعد جب خورشید سرینگر کے ائیر پورٹ پر اتر آیا تو ایر پورٹ پر وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوا، ٹیکسی میں سوار ہو کر خورشید اُس ماحول کو یاد کرنے لگا جو ماتم میں ڈوبا ہوگا۔ اور پھر اچانک یہ ماتم مسرت میں بدل جائے گا۔ صورت حال اچانک تبدیل ہوگی۔ غم خوشی میں بدل جائے گا۔

ان کو گلے لگایا جائے گا۔ ان کی بھلائی لی جائے گی۔ ان کا استقبال ہوگا۔ ٹیکسی میں سوار ہو کر اب خورشید بڑی تیزی سے گھر پہنچنا چاہتا ہے، وہ ایک ایک لمحہ گن رہا ہے۔ وہ ایک ایک ساعت کا حساب لگا رہا ہے۔

خورشید جب گھر کے نزدیک پہنچا اور ٹیکسی سے اُتر کر چلنے لگا تو دور سے ہی اس نے گھر کے پاس لوگوں کا اژدھام دیکھا، جونہی وہ نزدیک پہنچا تو اس نے جم غفیر میں ایک تابوت کو انسانی کندھوں پر دیکھا۔

ایسا منظر دیکھ کر خورشید ششدر ہوا، وہ دم بخود ہوا، وہ المناک حادثہ کا شکار ہوا، وہ ساکت کھڑا ہوا۔

جنازہ ان کے قریب آرہا ہے۔

یہ کس کا جنازہ ہے۔ اور یہ کون مرا گیا ہے؟

خورشید کو جب بتایا گیا۔ تمہاری موت کی خبر سن کر تمہاری بیوی کا ہارٹ اٹیک ہوا تو............

سرپرائیز حماقت میں بدل گیا۔

''چراغ کا اندھیرا''

کشمیر کی سیاسی، سماجی، اقتصادی زبوں حالی کے پس منظر میں ایک ایسی داستان عبرت جس نے اُردو ادب میں ایک مقام پالیا ہے۔ قانون، عدل و انصاف کی بیخ کنی، جمہوریت کے کھوکھلے دعوے، ظلم و جبر کے روپ

نیز سماجی ناانصافی کے پس منظر میں ایک ناولٹ ہے، عنقریب دوبارہ منظر عام پر آرہا ہے۔

''ایک زخم اور سہی!''

چند طویل افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو ماضی میں مختلف رسالوں میں چھپ کر اُردو ادب میں نہ صرف اپنا مقام حاصل کر گئے ہیں بلکہ ان افسانوں کا دوسری کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ ان پر کئی تنقیدی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔

''ایک زخم اور سہی''

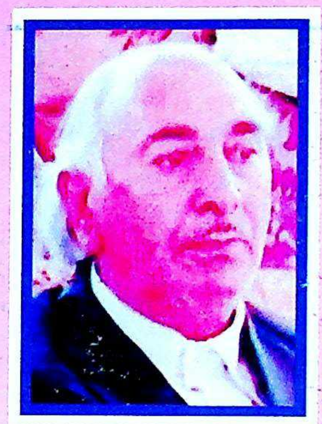
عرصہ چالیس سال کے بعد دوبارہ منظر پر لانے کے انتظام ہو رہے ہیں۔

''وقار'' پبلی کیشنز، بلیوارڈ، سرینگر

The new identity for J&K Bank is a visual representation of the bank's philosophy and business strategy. The counter- form created by the interaction of the squares 'which represents the three regions of the state ' is a falcon with outstreched wings- a symbol that represents the bank's vision of soaring to new heights of growth, with stability.

J&K Bank

Serving to Empower



شبنم قیوم کو میں نے ان کی کہانیوں کے ساتھ بہت قریب سے دیکھا، اور جب بھی دیکھا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، کشمیر میں اُردو ادب پر کتاب مرتب کرنے میں انہوں نے میری مدد کی میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں نے ان کے اندر کے فن کو دیکھا اور انہیں ان کا مقام دلانے کی کوششیں کیں۔

شبنم قیوم کو میں نے وقتاً فوقتاً ملک کے نامور عالموں اور ناقدروں سے ملایا جب ان کا کشمیر آنا ہوا۔ ان میں سید احتشام حسین، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شارب ردولوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جب بھی انہیں ایسی شخصیات سے ملایا تو ایک کہانی کار کی حیثیت سے، کیونکہ شبنم قیوم کی کہانیاں اُردو ادب میں ایک مقام رکھتی ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری
اپریل ۱۹۷۰